

مرد کا آنکھ اور عورت کی زبان کا دم
سب سے آخر میں ملتا ہے۔
مشتاق احمد یوسفی

urdukutabkhanapk.blogspot

مشتاق احمد یوسفی

ترتیب

ڈاکٹر مظہر احمد

اور
دیگر مضامین

© جملہ حقوق محفوظ

اقوال یوسفی	1	کتاب
مشتاق احمد یوسفی	1	مصنف
ڈاکٹر مظہر احمد	1	مرتبہ
ایچ ایس اے ٹیسٹ پریزنر، نئی دہلی۔	1	مطبع
ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز	1	نشر

10 میٹروپول مارکیٹ، 2724-25 کوہ پیلان، نئی دہلی، 110002

Aqwal-e-Yousufi

by

Mushtaq Ahmed Yousufi

Compiled by

Dr. Mazhar Ahmed

Cell: 09212089910 E-mail: mazhar_talat@yahoo.co.in

ISBN: 978-93-83282-50-0

Edition :2014

Price: ₹ 150/-

Library Edition: ₹ 275/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 098731156910 E-mail: abdu26@hotmail.com

اقوال یوسفی

اور

دیگر مضامین

مشتاق احمد یوسفی

ترتیب

ڈاکٹر مظہر احمد



اُردو کُتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

Our Distributors

Delhi/New Delhi

Kutub Khana Anjuman Taraqqi Urdu,
011-23276526

Maktaba Jamia Ltd., 011-23260668
Abulwalia Book Depot, 09618441306
Al-Balagh Publications, 09971877664
Nai Kitab Publishers, 011-65116661

Ahmedabad

Amreen Book Agency, 08401010786,
08938102056

Aurangabad

Mirza World Book House, 09325203227

Nagpur

Hamze Book Depot, 0712-2722546,
09823237556

Aligarh

Educational Book House, 09358251117
Maktaba Jamia Ltd., 0771-2706142

Allahabad

ShabKhuin Kitab Ghar
0532-7295065, 09450613861

Mumbai

Maktaba Jamia Ltd., 022-233774857
Kitab Deas, 022-23411854, 09866321477
Saleh Book Agency, 09830480292
Siddiqi Book Depot, 022-23455652
Aqsa Book Depot, 022-23454730
Abdus Salam Qasmi, 09113605836

Hyderabad

Huda Book Distributors, 09619130894,
020-24514892

Kolkata

Usamania Book Depot, 09122070654,
09433050035

Srinagar, J & K

Maktaba (Im-e-Adab) 06419407521,
0191-2482371

Jammu, J & K

Qasmi Kutub Khana 09792352280

Kerala

Payam Publications- 09945076110

عاشقانِ یوسفی کے لیے

فہرست

7	پیش گفتار
10	مشتاق احمد یوسفی کی شخصی اور ادبی زندگی طارق حبیب
43	اقوال یوسفی
43	طرز و مزاج
47	ادب
50	عورت
53	بچہ طبع
55	جانور
58	گراچی
60	مقتربات
112	چادر، چاندنی، چاند لہلی اور کالم بھر چاندنی
131	شاہ جی کی کہانی "دوسرے شاہ جی کی زبان"
147	خطبہ

پیش گفتار

صاحب طرز نظر اذیت نگار مشتاق احمد یوسفی کی چودہم تحریر چارمطبوعات منظر عام پر آئی ہیں۔ پہلی کتاب "بعنوان" "چراغ سے" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری تخلیق "خاکم بدھن" تقریباً دس سال بعد ۱۹۷۰ء میں زبور طبع سے آراستہ ہوئی۔ تیسری کتاب "زرگزشت" کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں اشاعت کے مراحل سے گزری اور آخری شاہکار بعنوان "آب گم" ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا یعنی تقریباً چوبیس سال قبل ان کی اب تک کی آخری کتاب شائع ہوئی اور اب سے ان کی اگلی کتاب کا پے پیٹی سے انتظار ہو رہا ہے۔ یہ عرصہ طویل بلکہ طویل تر ہے۔ اس دوران پاکستان سے چند خوشگوار خبریں بھی موصول ہوتی رہیں۔ آب گم کے پیش لفظ میں یوسفی نے یہ مژدہ سنایا تھا کہ اسی نوع (آب گم) کے باقی مضامین اور موجود ہیں۔ امید تھی کہ یہ مضامین بھی شیرازہ بندی کے مراحل سے گزریں گے۔ مگر جو وہ ایسا نہ ہو سکا۔ پھر خبر آئی کہ ایک ناول تیار ہے اور اسے پبلشر کے حوالے بھی کر دیا گیا ہے۔ بعد ازاں یوسفی اسے "پال" میں لگانے کے لیے واپس لے آئے۔ عاشقان یوسفی کے انتظار کے لئے توں بہنوئیں سے برسوں پر محیط ہو گئے۔ اس دوران مشتاق احمد یوسفی پر چند کتابیں بھی منظر عام پر آئیں جن میں راقم الحروف کی کتاب (صاحب طرز نظر اذیت نگار مشتاق احمد یوسفی) کے علاوہ ڈاکٹر محمد طاہر اور طارق حبیب کی کاوشوں کی ستائش بھی ہوئی مگر یوسفی کی تخلیقی وسعت کا انتظار طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی طرز و مزاج کے ادبی خزانے میں یوسفی پیش بہا اضافہ کریں گے۔

یوسفی کے فکر و فن کا جائزہ لینے والے قاضی نقادوں نے ان کے فن کی ایک اہم خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے اور وہ ہے جملہ سازی کا فن، اور اس فنی جہت نے یوسفی سے متعدد اقبال قلم بند کروائے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی طرح یوسفی بھی اپنے طرز و مزاج کو اقوال زریں سے سجاتے اور سنوارتے

ہیں۔ ان کے یہ قول ان کی کہانیوں اور بیانات سے یوں وابستہ ہو گئے ہیں کہ انھیں ان کے سیاق سے الگ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ ان کے یہ قول زندگی کی کسی حقیقت یا نصیحت کے پروردہ ہوتے ہیں۔ نیز مزاح کی آمیزش بھی انھیں اہم بنا دیتی ہے۔ دانش مندی اور ہنرمندی سے آراستہ یوسفی کے ان اقوال ذریعہ کی تعریف و توصیف پر خاص و عام نے کی ہے۔ اقوال سازی میں انہوں نے صنعت کاری سے بھی کام لیا ہے اور ذہانت سے بھی نیز مستفاد الفاظ اور مصطفیٰ صورت حال سے بھی فیض اٹھایا ہے اور لفظی و معنوی صنعتوں کے استعمال نے ان میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ جاذبیت بھی پیدا کر دی ہے۔ صنعت نظام، صنعت جنٹلمن و سلیج اور رعایت لفظی، قول محال اور تخیلی وغیرہ نے ان اقوال میں تازگی و شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ یوسفی کے یہ اقوال ان کی چاروں کتابوں کی زینت بنے ہیں۔ اقوال سازی کا یہ سلسلہ ان کی دواخری کتابوں (ذکر نشست، آبِ نم) میں نیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔ یوسفی کے یہ اقوال زندگی، معاشرہ اور فرد و سماج کی نقاب کشائی بھی کرتے ہیں، انصافی مطابق بھی کرتے ہیں اور فیسی نہیں میں سچے کی بات کہنے کی صلاحیت بھی ان میں موجود ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی اعلیٰ کتاب کے انتظار کے دوران میں نے طے کیا کہ ان اقوال کا ایک مجموعہ ترتیب دے کر انھیں نثران عقیدت پیش کیا جائے۔ قارئین چاہیں تو اسے ان کی پانچویں کتاب بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام اقوال ان ہی کے چاروں رقم ظہم کے مریبون منت ہیں۔ میں نے قارئین کی آسانی کے لیے مختلف عنوانات کے تحت انھیں ترتیب دیا ہے۔ یہ قول کے آخر میں کتاب کا نام بھی مندرج ہے۔ مگر مزاح، ادب، محاورات، طنز، جاناور کرناہی اور محققات کے عنوان سے ان اقوال کو ترتیب دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ میری اس ادنیٰ کاوش کی پذیرائی ہوگی۔

آبِ نم کے بعد مشتاق احمد یوسفی کے چند مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ اس سلسلے کے تین مضامین میرے پاس موجود تھے۔ چنانچہ بطور تحریک انھیں بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ ”چادر، چاندنی بی اور کلمہ نمر یا ندی“ کے عنوان سے بھرتی رحمن کے لکھنؤ فن کا محاکمہ کیا ہے جبکہ

دوسرے مضمون بعنوان ”شاہ جی کی کہانی“ دوسرے شادی کی زبانی ”میں شفیق عقیلی کی کہانیوں کے تقریباً اجرا میں پڑھا گیا، یہ جلسہ مارچ ۲۰۰۰ء میں گراچی میں منعقد کیا گیا تھا۔ تیسرا مضمون ایک تقریب پر مسجد کا خطبہ صدارت ہے۔ جس کا سن اشاعت ۲۰۰۲ء ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ملائقہ صیب کا مضمون ”مشتاق احمد یوسفی کی شخصی اور ادبی زندگی“ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ان کے سوانحی کوائف پر طائرانہ نظر ڈالی جاسکے۔

مجھے امید ہے کہ میری اس کاوش کو عاشقان یوسفی پسند فرمائیں گے۔ مشتاق احمد یوسفی اپنی عمر کی دسویں دہائی میں ہیں۔ مگر امید ہے کہ تھکیف و تالیف کا سلسلہ ہماری دیکھیں گے اور انشاء اللہ جلد ہی ہم ان کی نئی کتاب ہر کتابوں سے فیض یاب ہوں گے۔ اللہ انھیں صحت کے ساتھ باعمل زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔

تمام خیر خواہوں، بزرگوں اور ساتھیوں کو میرا سلام۔

منظہر احمد

اکتوبر ۲۰۱۳ء



اردو کتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

احاطہ کیے ہوئے ہے، جوان کی بینک کی پیشہ وارانہ زندگی (Banking Life) سے متعلق ہیں مگر ان کی زندگی کے دو حقائق اور اعداد و شمار (Facts and Figures) یہاں دستیاب نہیں، جو کسی تحقیقی ضرورت کو کامل طور پر پورا کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ”زرگزشت“ میں مشتاق احمد یوسفی نے اپنے حالات فراہم نہیں کیے۔ یہاں حالات زندگی بھی موجود ہیں اور ان میں کوئی غلط بیانی بھی نہیں کی گئی اور صرف ”زرگزشت“ ہی پر کیا موقوف ”مشتاق احمد یوسفی نے اپنے حالات زندگی اور اپنے متعلق کئی اہم اشارے اپنی چاروں تصانیف (”چراغ تلے“، ”خاکم بدین“، ”زرگزشت“ اور ”آب گرم“) میں مہیا کر دیے ہیں۔ ضرورت صرف انہیں دریافت کرنے اور سمجھنے کی ہے۔ راقم ۱۹۹۵ء میں مذکور بالا چاروں کتابوں سے مشتاق احمد یوسفی کا خود نوشت سوانحی خاکہ مرتب کرنے کی بھی ایک کوشش کر چکا ہے۔ مگر بات پھر وہی ہے کہ یہاں ہر بات اور ہر حقیقت دمر کے چراغ میں بیان کی گئی ہے، جس کی شرح اور تفہیم کا کام انہوں نے قارئین پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ”زرگزشت“ محض ذاتی کو انک نامہ معمولی سرگزشت یا راجہ سوانح عمری نہیں ہے، اس کے کئی ایک دوسرے مقاصد و مطالب بھی ہیں۔ یہ مزاح میں ملیوں ایک اہم ادبی دستاویز بھی ہے، فلسفہ حیات بھی ہے اور زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے کچھ ناگزیر اور حساس پہلوؤں کی رازدار اور امن بھی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کا تریانی وطن ہے پور، ضلع ٹونک، راجستھان، بھارت ہے۔ دو وہاں کے مقامی (Native) مسلمان تھے۔ ان کے باپ دادا بے پور میں نسلوں اور پشتوں سے آباد تھے۔ راجستھان (۲) بھارت کے شمال مغرب میں واقع ایک ریاست ہے۔ یہاں راجپوت اور راجپوتوں کے تھے۔ اسی باعث یہ راجپوتانہ بھی معروف ہے۔ راجپوتوں کی راج دھانی، راجستھان کا وجود کم و بیش ایک ہزار سال پرانا ہے۔ راجپوتوں کے بعد یہ مغل اور مرہاٹھ حکومتوں کے زیر نگیں رہا، مگر حکومت برطانیہ غالب رہی اور ہندوستان کی تقسیم کے بعد راجستھان بھی طور پر بھارت کا حصہ بن گیا، جو اس وقت بانیس ریاستوں پر مشتمل ہے۔ راجستھان اناج، صنعت، علم و ادب اور فنون لطیفہ کے لحاظ سے بھارت کا ایک زرخیز علاقہ ہے۔ (۳) راجستھان میں اند و آریں زبان بولی جاتی تھی۔ اس کے چار بڑے لہجے ہیں۔ شمال مغربی میواٹی، جنوبی مالوی، مغربی مارواڑی اور مشرقی ہے پوری۔ ان میں مقبول عام اور اہم ”مارواڑی“ ہی ہے۔ سرکاری زبان ہندی ہے۔ (۴)

مشتاق احمد یوسفی کی شخصی اور ادبی زندگی

طارق حبیب

یہ اردو زبان و ادب کی خوش قسمتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی جیسا ادیب اور دانشور اُسے میسر آیا۔ تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ ہندو فن کا اس امر پر اتفاق بھی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اردو زبان و ادب کے بے مثال ادیب ہیں۔ کسی ادیب کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا مہمدا سے محبت اور غلام سے اپنائے اور اپنا سرمایہ تسلیم کرے (۱)۔

بارشہ ادب زندگی کا بہترین نقاد اور محاسب ہے۔ ادب اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ جوں جوں ٹھٹھے ہوئے ہیں کہ علیحدہ نہیں کیے جاسکتے، لہذا اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ کسی فنکار کی زندگی اُس کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی، تو یہ بات جزوی سچائی ہو سکتی ہے، کلی صداقت ہرگز نہیں، کیوں کہ کسی بھی انسان کے فنی حالات بردار مست یا بالواسطہ اُس کے فن پر اثر انداز ہوتے ضرور ہیں، اس لیے بہتر تنقیدی نتائج اخذ کرنے کی خاطر تحقیق کے ثمرات سے استفادہ ہمیشہ سودمند رہا ہے۔

اس پس منظر میں تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کوئی بھی تنقیدی رجحان یا نظریہ غائب ہو، تحقیق کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر عمرانی تنقید عہد اور سماج سے بے خبری کو اندہ متانگی میں مزامم کر دیتی ہے، تو نفسیاتی تنقید میں فنکار کے فن کی گرد کشائی کے لیے حالات زندگی اسی اکلید ہیں۔ ہم آج کا فائدہ ان تمام طریق بائے تنقید کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ کر دیکھیں اور پرکھنے کے بجائے انہیں ایک ہی اکائی میں پرو کر سمجھنے اور سمجھانے کا قائل ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب ”چراغ تلے“ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی، دوسری تحقیقی ”خاکم بدین“ ۱۹۷۰ء میں سامنے آئی۔ تیسری تصنیف ”زرگزشت“ ۱۹۷۶ء میں اشاعت کے مرحلے سے گزری، چوتھا اور تاحال آخری شاہکار ”آب گرم“ ۱۹۹۰ء میں روٹائی کے لئے پیش کیا گیا۔

”زرگزشت“ مشتاق احمد یوسفی کی زندگی کے اُن پچیس برسوں (۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۴ء تک) کا

’نوٹک‘ ایچہ اصطلاح پر مشتمل ایک ریاست تھی جو برائچہ تانے اور وسط ہند کے درمیان واقع تھی۔ نوٹک علی گڑھ اور نیپاڑہ درانچہ تانے میں اور باقی تین اضلاع پچھیرہ، پٹراہو اور سرونیچہ وسط ہند میں آتے تھے۔ نوٹک (۵) ریاست ہی کے ایک ضلع کا نام بھی ہے۔ شروع کار میں اسے دریا کی تقریری کہا جاتا رہا، پھر ’نوٹکوا‘، پکارا جانے لگا، جو آخر کار نوٹک پر منتج ہوا۔ اسلامی حکومت کے قیام کے دوران میں اس کا نام ہمہ آباد بھی رکھا گیا۔ نوٹک بھی راجستھان میں شامل ہے۔ یہ ساری ریاست زیادہ تر ہندو مذہب کی حامل ہے۔ (۶)

مشتاق احمد یوسفی اندرون ساکن گیری گیت رہتے ہیں۔ یہ ان کا آبائی مسکن ہے۔ ان کی پیدائش نوٹک میں ہوئی، پھر آٹھ سال کی عمر میں واپس بے پور آ گئے، مادری زبان مارواڑی ہے۔ دو حوال سے یوسف زئی پٹھان اور تھیال سے رانچہ ت (راٹھور) ہیں۔ خود کیجئے کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے، لیکن کمال لگن، شایانہ روز محنت اور عطائے رب کریم سے زبان فردو میں جو مقام نہیں حاصل ہوا، وہ اصل زبان کو بھی بعض اوقات کم ہی افسوس ہوتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے دادا کا نام ’ملنگ خان‘ تھا، جو اپنے والد کی ادھیڑ عمری میں کسی ملک کی دعا سے پیدا ہوئے۔ ملنگ خان مہاراجہ بانی سکول بے پور سے متحرک اور مہاراجہ کانچے بے پور رانچہ تانہ پور سے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کر کے پوسٹ ماسٹر کے طور پر ملازم ہو گئے اور ملازمت کے سلسلہ میں ڈگ پور، آگرہ، رام پور شریف اور بے پور میں رہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی وادی کا نام ’’نوری بی‘‘ تھا، جو ’’نوری بی‘‘ تھا، جو ’’نوری بی‘‘ رہنے والی تھیں۔ نور بی بی کے سلطان سے ’’عبدالکریم خان یوسفی‘‘ پیدا ہوئے، جو مشتاق احمد یوسفی کے والد ہیں۔ (۷)

مشتاق احمد یوسفی کے دادا احمد بخش مسلمان راٹھور اور امیر شریف کے قریب آباد کے رہنے والے تھے اور ان کی نانی ’’جادرے‘‘ کی تھیں۔ احمد بخش راٹھور انڈیپنڈنس آف پولیس کے عہدے سے سبک دوش ہوئے تھے۔ عوامین شہر میں انہیں گنا جاتا تھا۔ خان بہادر یا خان صاحب کا خطاب بھی انہیں میسر آیا۔ روایات کے مطابق وہ بہت دین دار انسان تھے۔ مشتاق احمد یوسفی بتاتے ہیں کہ اردو خط کی مشق ان کے ۲۲ نے ہی انہیں کرائی۔ ان کے دادا نانی کے ایک چٹا اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی والدہ کا نام مسعود جہاں اور ان کے ماسوں کا نام عبدالعزیز تھا۔ ماسوں اور بیٹوں خالوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماسوں اور ایک خالہ کا انتقال کراچی میں، جبکہ دو خالوں کا انتقال ہندوستان میں ہوا۔ (۸)

مشتاق احمد یوسفی کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی ہے۔ عبدالکریم خان یوسفی نے مہاراجہ بانی سکول بے پور سے متحرک مہاراجہ کانچے بے پور (رانچہ تانہ پور) سے انٹرمیڈیٹ اور مہاراجہ کانچے بے پور (آگرہ یونیورسٹی) سے ۱۹۱۳ء میں بی اے کیا اور یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ بے پور کے پہلے تھانوی مسلمان تھے، جنہوں نے بی اے کیا۔ مختلف مصاحبوں (Interviews) اور رازگشت کے تفصیلی مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالکریم خان یوسفی ایک پابند شرع اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ لفظ یوسفی کی وضاحت کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی نے بتایا کہ:

’’۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء میں سے کسی سال میرے والد پٹنار تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو پٹھان یوسف زئی کہا، ان کا علاقہ ڈاڈا گیا کہ آپ کیسے پٹھان لوگ ہیں، اس کے لیے تو صدیوں سے بے پور میں آباد تھے۔ وہ جب واپس آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو یوسف زئی کہا، چھوڑا یا اور اس کی تک یوسفی کہنے لگے اور میں نے ’’خان بھی Drop کر دیا۔‘‘ (۹)

عبدالکریم خان یوسفی شروع میں اسکول ٹیچر رہے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۱ء تک نوٹک میں پرنسپل سیکریٹری یعنی انگریز ریڈیو ڈیپٹ اور نوٹک کے درمیان رابطے کا ذریعہ رہے۔ ۱۹۳۱ء میں واپس بے پور آ گئے اور کچھ عرصہ پکار رہے۔ پھر مختلف کچھو کچھو پارکے۔ اس زمانے میں امیر علی بیکو بھٹی سکرینٹ کی واحد کہانی تھی، جو انگریزوں کی ملکیت تھی۔ کچھ عرصہ اس کہانی کی انگریزی بھی ان کے پاس رہی، پھر خفیہ رہی کرتے رہے۔ آخر کار عبدالکریم خان یوسفی سیاست کے میدان میں اترے۔ وہ بینٹ مسلم لیگ کے صدر حزب اختلاف اسمبلی کے لیڈر اور قانون ساز اسمبلی

(Legislative Assembly) کے ڈپٹی سیکریٹری رہے۔ بے پور میونسپلی کے ’’دوسرے میئر (Mayor)‘‘ بھی رہے۔ چار سیاسی وچوات کی بنیاد انہیں بے پور (بھارت) چھوڑنا پڑا، سقوط حیدر آباد کے موقع پر اپنی من کوئی کے باعث پاکستان اور مسلمانوں کے موقف کی بحران و حمایت کے لیے میں انہیں جھرت کرنا پڑی۔ (۱۰)

’’وہ بہت صاف گو انسان تھے، سچ کہنے سے ڈرا نہیں نکلتا تھے۔ تو

Legislative Assembly کے ایک اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ وہ ان تھا

جب ہندو آباد پر حملہ ہوا تھا اور کانہہ انہیں کی وفات کا بھی یعنی ۱۹۴۸ء کا واقعہ تھا

سب EPRect ہوتی ہیں۔ تو بہت فرق پیدا ہونے میں آتا تھا۔ وہ ہے۔ یہ تو

سفری ہے، جو میں نہیں ہوں گا۔" (۱۲)

اسی طرح ایک اور اعتراض میں کہتے ہیں:

"میں آپ کو پیدائش کا سال نہیں بتاؤں گا، کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" (۱۵)

"چراغ تھے" جو ان کی ادبی زندگی کا پیدائش کا قاعدہ نقش ہے، میں لکھتے ہیں:

"کیا تار، پیدائش ہی ہے؟ بلکہ ترک کے غریبیت میں درج ہے۔" (۱۶)

یہ اہم اور دل چسپ پہلو ہے کہ مشتاق احمد یو کی اپنی اصل تاریخ پیدائش بتانے سے گریزاں ہیں اور اس سے بھی دل چسپ یہ امر کہ اپنی تاریخ پیدائش کے مسئلہ کو موضوع بحث (اور موضوع فن) بنا رکھا ہے۔ وہ چاہتے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہی نہ کرتے۔ مگر انہوں نے اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ حقیقی تاریخ پیدائش کچھ اور ہے، جس کے اظہار سے ان کے کئی ایک معاملات متاثر ہوتے ہیں۔

اصول تحقیق میں مفروضہ (Hypothesis) کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے ہم نے کچھ مفروضات کو ہوا دی ہے، مثلاً ممکن ہے کہ یہ سارا جھڑا محض بحث برائے بحث اور ان کے گفتگو انداز تحریر و تقریر کا کوئی کرشمہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی اپنی اصل تاریخ پیدائش سے اتنے ہی ناواقف ہوں، جتنے کہ ہمارے سمیت دوسرے ناقدین و محققین اور قارئین ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس اتفاقی واقعہ کو نقلی ہو، جس کا اظہار زبردست میں یوں ہوا ہے:

"کائنات، تاریخ اور جہانے ولادت کے انتخاب میں ہر دو ٹھیک لیا

لیا۔" (۱۷)

شیر یہ سب کچھ تو یو کی اہلیات میں آگیا، اب ہم اصل معاملے کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ زبردست جو مشتاق احمد یو کی کی سوانح عمری ہے اس کے حقیقی نتائج ہیں:

"زبردست" میں کوئی نیا پیدائش نہیں ہوئی۔" (۱۸)

اس بیان کی روشنی میں جیسا زبردست ہے۔ ان کے مضمون پر غور کرنا چاہئے:

"مثلاً یہی کہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

"کلمہ حر کو ہوتا تھا تو کب (راجہ تھان) میں۔" (۱۹)

وہ کسی کانگریسی گھر نے یہ Resolution پیش کیا کہ حیدر آباد چلے جومیا ہے، اس کی روشنی میں ہمیں ہوجانی چاہیے تو میرے والد جو Session کی صدارت کر رہے تھے، انہوں نے یہ Ruling دی کہ جتنی کا کوئی جواز نہیں ہوتا، اس لئے کہ آج اگر آپ اس نوٹی میں جتنی کرتے ہیں کہ حیدر آباد چلے جومیا ہے تو کل جب پاکستان، کشمیر چلے گئے گا تو آپ کتنے دن سوگ میں بند رہیں گے۔ تو یہ سننا تھا کہ اودم چل گیا۔ لوگوں نے انہیں گھر پر مشورہ دیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں، میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے چلے گئیں۔" (۲۰)

یوں عبدالغفریم خان یو کی اس واقعے کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء ہی میں پورے ہجرت کر کے حیدر آباد (پاکستان) آگئے۔ یہاں انہوں نے کوئی ملازمت یا کاروبار نہیں کیا۔ ۲۶ جون ۱۹۵۰ء کو یہ حالت روزہ، جب وہ حیدر آباد سے نکلوا آدم گئے ہوئے تھے، ان پر دل کا دورہ پڑا اور خاق حقیقی سے جا ملے بور حیدر آباد کے ہسپتال قیصرستان میں ۲۷ جون ۱۹۵۰ء کو سپرد خاک ہوئے۔ مشتاق احمد یو کی کی والدہ جو اسے (Asthma) کے مارے میں جکڑ گئیں، ۱۹۵۱ء میں حرکت قلب ہو جانے سے وفات پا گئیں۔

تیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے آغاز میں عبدالغفریم خان یو کی اور مسعود جہاں رھیز ازاد واقع میں منسلک ہوئے۔ (۱۲) اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کیں۔ چاروں کے نام شوکت آراء مشتاق احمد خان یو کی، فردوس جہاں اور ادورس احمد خان یو کی ہیں۔

سرکاری کاغذات کے مطابق مشتاق احمد یو کی ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے۔ یہی تاریخ ان کے منظر کے سند میں بھی درج ہے۔ یہی تاریخ ذکر کیا یو کی خود بھی ملتان، میں لکھے جانے والے ایم اے (اردو) کے مقالے میں بھی درج ہے۔ (۱۳) تاہم یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔ مشتاق احمد یو کی کی تاریخ پیدائش کا معاملہ اہم اور پیچیدہ ہے۔ اپنی سوانح عمری زبردست میں بھی جہاں انہوں نے اپنے حالات زندگی کا مفصل ذکر نہیں کیا، وہاں انٹرویوز میں بھی اس اہم معاملے کو میزبانوں میں رکھ چھوڑا ہے، لیکن ان کی اصل تاریخ پیدائش یہ تھا کہ وہ ہے۔ انہوں نے انٹرویو کے دوران میں خود بتا دیا کہ:

"Official" تاریخ پیدائش ۳ مارچ ۱۹۴۳ء ہے۔ اصل تاریخ پیدائش اور ہے،

جس کو میں اس لئے نہیں بتاتا کہ اس سے میری حاضرت، میری فائمن وغیرہ

”زور گزشت“ کی صداقت کے پیش نظر ”یکم محرم الحرام“ کو حقیقی تاریخ مان لینے میں کوئی عذر نہیں۔ اب اگر ”یکم محرم الحرام“ کو بغیر تاریخ کا قیوم (۱۰) میں دونوں تاریخوں کا مقابلہ کیا جائے تو ۱۹۲۳ء عوی کے مقابل، جو ہجری سال سامنے آتا ہے، وہ ۱۳۴۲ ہجری۔ جتنا ہے اور یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری ۲ مارچ ۱۹۲۳ء کے بجائے ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء کی تاریخ سامنے آتی ہے۔ اس طرح دونوں تاریخوں کا موازنہ کرنے سے دس دنوں کا فرق نکلتا ہے بشرطیکہ یہ یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری ہی ہو، جو ۱۹۲۳ء کو فرض کر کے طے کیا گیا ہے۔

”تقویم ہجری و عیسوی“ کے علاوہ جو ہر تقویم سے استفادہ کرتے ہوئے بھی یہی تاریخ موصول ہوتی ہے۔ ”جو ہر تقویم میں“ دیے گئے جدول کے مطابق ۱۹ محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری کے مقابل یکم قمر ۱۹۲۳ء کی تاریخ درج ہے اور اس میں سے اشارہ دون نکال کر یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری کی تاریخ کا مقابلہ کرنے سے ۲ مارچ ۱۹۲۳ء ہی کی تاریخ برآہم ہوتی ہے۔ (۲۱) یکم یہ تاریخ بھی حرم آخر نہیں البتہ اس کے درست ہونے کا امکان، ہر حال موجود ہے۔ امکانی سطح پر اگر یکم محرم الحرام کو بغیر تاریخ کریم تاریخوں کا تعین کیا جائے تو کچھ یوں نتیجہ موصول پائے گا:

- ۱۔ یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ء۔ یہ مطابق ۲۲ مارچ ۱۹۲۳ء
- ۲۔ یکم محرم الحرام ۱۳۴۳ء۔ یہ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء
- ۳۔ یکم محرم الحرام ۱۳۴۴ء۔ یہ مطابق ۲ مارچ ۱۹۲۳ء

معتدل اور محتاط انداز سے کے مطابق درمیانی تاریخ یعنی ”یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ ہجری“۔ شبہ یہ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ عیسوی بروز منگل کے درست ہونے کا زیادہ امکان ہے، یہ اس لیے کہ امارا دین بھی درمیانے راستے کا اختیار کرنے کی تہنیں کرتا ہے۔

اب ایک اور دل چسپ تحقیقی صورت حال غلاحظہ ہو۔ درج بالا ساری جدوجہد کے بعد جو تاریخ ہم نے دریافت کرنے کی کوشش کی، اس کا امداد تاریخ تواریخ اخیل کا بیجا بایونی درشنی لاہور میں رشید احمد صدیقی اور مشفق احمد یوسفی کے تالیفی مطالعے پر مبنی ایک مقالے (۱۹۹۰ء) میں شرا لہما نے پہلے ہی سے کر دیا ہے۔ (۲۲) ایجنہ برہمہ الدین ذکر یونیورسٹی ملتان میں آپ گم پر لکھے جانے والے ایک مقالے (۱۹۹۲ء) میں طارق رشید نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے:

”تاریخ پیدائش ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء۔“ (۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ درج بالا دونوں تحقیقین نے مشفق احمد یوسفی کی تاریخ پیدائش بہاء الدین ذکر یونیورسٹی ملتان کے تحت ۱۹۸۳ء میں محمد اصغر کے لکھے ہوئے مقالے (۲۴) سے لی ہے، جہاں اصل ۲ مارچ درج ہے، مگر بعد میں آنے والوں نے غلطی سے ۲ مارچ کو ۱۳ مارچ سمجھ لیا، کیوں کہ اگر یہ تاریخ غلطی سے درج نہ ہوئی ہوتی، تو اس کے ساتھ کوئی سند یا کوئی اختلافی بحث، یا کسی قسم کی تحقیقی وضاحت ضرور موجود ہوتی، جیسا کہ ہم نے درج بالا صفحات میں اپنی کوشش کی ہے، تاہم دونوں مقالہ نگاروں نے تحقیق، تصدیق اور توجہ کے بغیر ۲ کو ۱۳ بنا دیا کہ یہ تیوں تحقیقی و تحقیقی مقالہ جات اہم اسے (اردو) کی سطح پر قلم بند کیے گئے ہیں۔

اور تو اور یہی تاریخ غلطی ۲۰۰۵ء میں یونیورسٹی آف سرگودھا کے تحت ایچ اے اردو کی سطح پر لکھے جانے والے ایک مقالے میں خرمہ اکرم نے بھی کی ہے، جب کہ ۲۰۰۳ء میں شاہد یونس والی تہاڑی کتاب ”مہمضیات“ بھی ان کے پیش نظر تھی۔ انہوں نے شاید مشفق احمد یوسفی کے ”یہاں سے زیادہ ہمارے مفروضے کو اہم خیال کیا ہے اور اگر یہی ہے تو بھی اس پر کسی قسم کا کوئی شائبہ نہیں رہا گیا، جنس ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء کی تاریخ درج کر دی گئی ہے۔ (۲۵)

اگرچہ مشفق احمد یوسفی کا آبائی وطن ہے پورا اور جائے پیدائش قطعی طور پر ٹوٹکے ہے مگر تاریخ پیدائش کی طرح ان کی جائے پیدائش، میں بھی ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ ”خاکِ بدین“ کے عقد سے میں شان الحق حقی سے مکالمہ کرتے ہوئے مشفق احمد یوسفی لکھتے ہیں:

”جنگ نہرو بسے باں قصور، یاد آیا۔ آپ نے ایک جگہ نوید کی لکھا ہے۔ یہ

جگہ تو یہیں گدی اردو آپ نے کہاں سے نیکی؟ عرض کیا مارواڑ میں، جہاں ہم رہا

ہوئے۔ نہیں کار، تانہ گرفت، چاند پر گئے لگاتے ہوئے ہوئے تو گویا مراد آپ کی

جگہ، زبان نہیں ہے۔“ (۲۶)

ایک جگہ وہ مارواڑ میں اپنی پیدائش سے آگاہ کرتے ہیں اور دوسری جگہ ٹوٹکے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ سوانحی ادبیات سے ”زور گزشت“ کی اہمیت، بقید ہر کتاب سے زیادہ ہے، دراصل مارواڑ کا ذکر خاکِ بدین کے مقدمے میں آواہ اور تحقیقی نقطہ نظر سے مصنف کے خود نوشت مقدمے کو بغیر ادبی مافذ اور سند مانا جاتا ہے۔ یہ ساری بحث یوسفی صاحب سے کی گئی، تو انہوں نے بتایا کہ مارواڑ کا ذکر انہوں نے جانے پیدائش کے بجائے ماہوری زبان کے اعتبار سے کیا ہے، کیوں کہ اس وقت پورے

راہبستان کی قبول زبان مارواڑی سی تھی اور پھر قطعی طور پر کہا:

”ہمارا ہستخان کی سہرہ یاست ”لوکھ“ میں پیدا ہوئے۔“ (۱۷)

اس بحث کا مقصد مشتاق احمد یحییٰ پر گرفت کرنا ہرگز نہیں اور نہ ہماری ایسی مجال ہے، یہ وضاحت مفصل تحقیقی طور پر خود اشتہار سے نیچے اور دیگر قارئین و محققین کو کسی تشویش سے بچانے کی خاطر کی گئی ہے، اس لیے کہ جنرل افغانی سطح پر لوکھ اور مارواڑ ہر حال دو علیحدہ علیحدہ مقامات ہیں۔ البتہ اکثر قارئین راہبستان، لوکھ اور بے پور کی طرح ”ست وائسا“ کو بھی اہم مکان خیال کرتے ہیں، جو کہ بڑی غلط فہمی ہے۔ ست وائسا اہم مکان نہیں، اہم صفت ہے۔ دراصل مشتاق احمد یحییٰ کی پیدائش سات ماہ کے بعد ہوئی، یعنی دو ست ماما یا ستوائسا (۲۸) ہیں ان کے اپنے بھول:

”نشاں ایک Premature baby، سات مہینے ہی میں پیدا ہو گیا۔“ (۲۱)

زندگی کے پہلے آٹھ سال مشتاق احمد یحییٰ نے لوکھ ہی میں بسر کئے، وہیں ہے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور تیسری جماعت تک لوکھ ہی میں زیر تعلیم رہے۔ پھر ۱۹۳۱ء میں اپنے آبائی شہر بے پور واپس آ گئے۔ مہاراجہ ہائی سکول بے پور سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ حساب، فارسی اور فرانسیسی میں کمزوری یا عدم دلچسپی کی بنیاد پر انہیں میٹرک میں سینئر کلاس میسر آئی لیکن میٹرک کے بعد مہاراجہ کانچے بے پور (راہبستان بورڈ) سے انٹر میڈیٹ میں فیسٹ کلاس فیسٹ رہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ راجپوتانہ بورڈ سے انٹر میڈیٹ میں اول پوزیشن پر گولڈ میڈل حاصل کرنے والے وہ پہلے مسلمان ہیں۔

انٹر میڈیٹ میں انہوں نے انگریزی ادب، تاریخ، فلسفہ اور اردو ادب کو جی اے میں انگریزی ادب، فلسفہ اور تاریخ کے مضامین پڑھے اور مہاراجہ کانچے بے پور (آگرہ یونیورسٹی) سے ۱۹۳۳ء میں بی اے میں اول پوزیشن اور انگریزی ادب میں ریکارڈ قائم کرنے پر کرنل ادگوئی گولڈ میڈل، حاصل کیا۔ یہ میڈل اور پوزیشن حاصل کرنے والے بھی وہ پہلے مسلمان گریجویٹ (Graduate) ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ایک بڑی دلچسپ اور قابل رشک بات منظر عام پر آتی ہے کہ ملک خان، عبدالکفریم خان یحییٰ اور مشتاق احمد یحییٰ (یعنی دادا، جیٹا اور پوتا) نے ایک ہی اسکول (مہاراجہ ہائی سکول بے پور) سے میٹرک اور ایک ہی کانچے اور تیسری بورڈ (مہاراجہ کانچے بے پور اور راجپوتانہ بورڈ) سے انٹر میڈیٹ کیا، نیز مشتاق احمد یحییٰ اور ان کے والد نے ایک ہی کانچے (مہاراجہ کانچے بے پور،

آگرہ یونیورسٹی) سے بی اے کیا۔

۱۹۳۵ء میں مشتاق احمد یحییٰ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور فیسٹ کلاس فیسٹ رہے۔ لیکن اول پوزیشن کے باوجود گولڈ میڈل نہ ملا۔ اسی عرصے میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فیسٹ کلاس میں ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی، البتہ کوئی پوزیشن حاصل نہ ہوئی (۳۰) یہ شاید فلسفہ میں ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کا آخری ہو کر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ مذہب کے بالکل قائل نہ رہے (۳۱) مگر بعد ہی اس طرف لوٹ آئے۔ دراصل آگاہی کی منازل طے کرتے ہوئے راستے میں تخلیق کے پڑا ابھی آتے ہیں اور اگر انسان میں ذرا بھی طبع اور ظرف ہو تو یہی تخلیق اس کی تفصیل اور تفصیل کیا کرتی ہے (۳۲)

دینی تعلیم کے علاوہ انہوں نے قرآن پاک اپنے والد گرامی سے بارہ تیرہ سال کی عمر تک (تا عمر) پڑھا اور قصص الانبیاء والدہ ہی سے سیکھ لی۔ اس کے علاوہ ۵۵ء تا ۹۷ء میں ایک شاہی اور ایک مصری استاد سے عربی بھی سیکھتے رہے۔ ایم اے فلسفہ اور ایل ایل بی تک تعلیم مکمل کرنے کے اگلے ہی برس یعنی ۱۹۳۶ء میں مشتاق احمد یحییٰ نے انڈین آؤٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس شپ آئل اینڈ گیس کا امتحان پاس کیا، لیکن انہیں یہ ملازمت اس لیے ہسر نہ آئی کہ ان کی نظر (Eye Sight) بہت زیادہ کمزور (ضعفی سات) تھی۔ اس حوالے سے انہوں نے پورے نظام (System) پر بالعموم اور مذکورہ بالا سلیکشن کمیٹی پر بالخصوص بڑی لطیف طنز اور تضحیک کی ہے کہ:

”میری کوئی قدرتی نہیں تھی، وہ بالکل بھول کی آنکھیں کمزور ہوتی ہیں۔“ (۳۳)

بعد ازاں وہ پرنسپل مول سروس میں آ گئے، جب کہ ان کی والدہ کچھ اور چاہتی تھیں:

”والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور عرب جا کر وہاں کا مفت علاج

کروں۔“ (۳۴)

در اصل قدرت مشتاق احمد یحییٰ سے اس سے بھی بڑا کام لینا چاہتی تھی، اس لیے والدہ کی خواہش کے باوجود میڈیکل ڈاکٹر نہ بنے، بلکہ دنیا کے ادب کے معالج بنے اور عرب کے بدوؤں کے بجائے ادب کے بدوؤں کا مفت طبیاتی علاج کرنے لگے۔

۱۹۳۶ء میں مشتاق احمد یحییٰ پرنسپل سول سروس (PCS) میں آئے اور دسمبر ۱۹۳۹ء تک ڈپٹی کمشنر اور ایڈمنسٹریٹو آفیسر رہے۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ان کے والدہ، والدہ، بھائی اور بہن اجمرت کر

کے حیدر آباد (پاکستان) چلے آئے۔ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو مشتاق احمد یوسفی خود بھی یہ عہدہ سنبھالے اور یہ اعزازات چھوڑ چھاڑ کر (کراچی) پاکستان آ گئے۔ ان کی بیوی اور ایک بچہ مارچ ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچے۔ اپنی ہجرت کے متعلق بتاتے ہیں:

”پاکستان میں اس دنایہ آیا کہ جون ۱۹۴۹ء میں انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ وہاں

سرکاری زبان نہیں رہے گی۔ اس وقت تک اردو سرکاری زبان تھی اور لغو کام اردو ہی

میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر ہم نے رخصت کی اور یہاں آ گئے۔“ (۱۵)

اس ایک امر سے مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت اور کردار کے کئی رخ متعین ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت کی تفہیم کے لئے یہ پہلو کسی بھی اعتبار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے جنوری ۱۹۵۰ء میں پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور کراچی شہر کو اپنا مستقل قرار دیتے ہوئے بینکاری کے شعبے سے اپنے درخشندہ و تابانہ مستقبل کا آغاز کیا۔

”صعہ داران پاکستان اور قائد اعظم“ کا نام اس صاحب میں ایک نام ایم اے اسلمبانی کا بھی ہے، جو ایک غیر سرکاری، دہائی کہنی Orient Air Ways کے مالک اور مسلم کرشل بینک لمیٹڈ کے چیئرمین تھے۔ انہی خاص نو سوساے مشتاق احمد یوسفی کا ان سے رابطہ ہوا اور اسلمبانی صاحب نے ان کا تقریر ”اوری انٹائیرو“ میں کرو یا۔ اسی دوران میں اس کہنی کا ایک جہاز گر کر تباہ ہو گیا، جس کے باعث احمد یوسفی صاحب نے یہ ملازمت اختیار نہ کی مگر پھر مسٹر ایم اے اسلمبانی ہی کے ذریعے سے وہ بینک کی ملازمت میں آ گئے (۱۶) اور چالیس برس تک بینکاری کے شعبے سے وابستہ رہے۔ پاکستانی بینکاری کے شعبے کو تنظیم کرنے اور اسے باقاعدہ بنانے میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ یاد رہے کہ پاکستانی بینکنگ سے ارتقاء میں مشتاق احمد یوسفی کی خدمات اس قدر اہم ہیں کہ اس حوالے سے ایک علیحدہ تحقیقی مقالے کے ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مشتاق احمد یوسفی نے ۳ مئی ۱۹۵۰ء کو مسٹر کرشل بینک لمیٹڈ (۱۷) کے جنرل منیجر مسٹر ایڈنڈ کو انکوائریو سے کر ۳ مئی ۱۹۵۰ء کو، کنونینٹڈ آفیسر کی حیثیت سے بینک کی ملازمت اختیار کی۔ ۳ نومبر ۱۹۵۲ء کو Inspector Of Branches مقرر ہوئے۔ ۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو چیف اکاؤنٹنٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ء کو مسٹر کرشل بینک لمیٹڈ کے اسٹیبلشمنٹ جنرل منیجر اور ایم ایچ ایل ۱۹۶۳ء سے اپریل ۱۹۶۵ء تک ڈپٹی جنرل منیجر کے

عہدے پر تعینات رہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۳ نومبر ۱۹۷۳ء تک آسٹریلیا بینک لمیٹڈ (جوا) نیڈرلینڈ بینک لمیٹڈ کا پرائیڈم ہے) کے مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے جب تک جنوری ۱۹۷۳ء کو قلم بینک Nationalized ہوئے یعنی قومیا لیے گئے تو مشتاق احمد یوسفی یکم جنوری ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک ”یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ“ کے صدر رہے۔ ۷۸۔۷۹ء تک پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین رہے۔ جنوری ۱۹۷۹ء تک ڈائریکٹر انٹرنیشنل کارپوریشن آف پاکستان، ڈائریکٹر فیصل انٹرنیشنل ٹرسٹ، وائس چیئرمین آف کونسل آف وی انسٹیٹیوٹ آف بینکرز ان پاکستان، ڈائریکٹر پاکستان ایگریکلچرل سٹوریج کارپوریشن، وائس مینجیر آف وی پاکستان ٹرانس ایسوسی ایشن، چیئرمین امتحان کمیٹی آف وی انسٹیٹیوٹ آف بینکرز ان پاکستان اور چیئرمین ایڈیٹریل آف بینکرز ان پاکستان کے اعزازی عہدوں پر بھی رہے اور Fello of the Institute Of Bankers in Pakistan تو ایک مستقل چیز ہے۔ (۳۸)

جنوری ۱۹۷۹ء میں مشتاق احمد یوسفی لندن چلے گئے جہاں وہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک (Bank of Credit And Commerce International (BCCI کے ایڈوائزر رہے اور بنائے گئے کے بعد ۵ نومبر ۱۹۹۰ء کو پاکستان واپس آ گئے یوں یہ گیارہ برس کا زمانہ انہوں نے اپنے ملک سے باہر گزارا (۳۹)

۱۹۹۰ء کے بعد سے پیشہ وارانہ مصروفیات تمام ہو گئیں۔ ۱۹۹۱ء سے کراچی میں فراغت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ادبی مصروفیات معمولات حیات ہیں۔ علمی و ادبی تقریبات اور مطالعاتی ترغیبات ہی زندگی کا اٹھال ہیں۔ اب جب کہ مشتاق احمد یوسفی کی سوانحی تفصیلات مکمل ہو گئی ہیں، ایک مختصر جملی کا ازالہ کر لینا چاہئے اور ادبی و ادبی کلویڈ یا (فیروز سنز لاہور) میں یوں لکھا ہے:

”مشتاق احمد یوسفی (؟) اردو کے صاحب طرز محرمات نگار، ستارہ (کوئٹہ،

راہستہ بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آبائی مسکن ہے چوہلی گڑھ پورہ ندی سے ایم اے

(انٹیکس) کیا۔ ایک غیر ملکی بینک کی دہلی شاخ میں ملازمت کی۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی

آ گئے اور متعدد اعلیٰ اور غیر ملکی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۳ء میں یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

کے صدر مقرر ہوئے تصانیف چراغ گلے خاکم بدایں اور زرگزشت (آغا خان کراچی

فیروز سزاسانی کلویڈیا کے مرتبین نے غلامحسبی اور ناقص تحقیقی عمل کی بنا پر مشتاق احمد یوسفی کو ڈیکننگ سے وابستہ ہونے کی بنا پر ایم اے آکسفورڈ تیار ہے حالانکہ وہ ایم اے فلسفہ ہیں۔ انہوں نے چنگ کی کسی دہلی شاعری میں ملازمت نہیں کی، بلکہ بھارت میں وہ سول سروس میں رہے اور Banking Life کا آغاز جنوری ۱۹۵۰ میں کراچی (پاکستان) میں مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ سے کیا اور یہاں بھی کسی غیر ملکی بینک سے وابستہ نہیں رہے اسی طرح ستوا سنا کوئی مقام نہیں صورت حال ہے، جس ثابت ہوا کہ محض اندازوں کی بنیاد پر کمزری کی نفی تحقیق کی پڑ شکوہ عمارت ایک نہایت دن ضرور گر پڑتی ہے اور یوں اس کے زیر سایہ بیٹے والوں کے بہت سے (جاپانی اور مالی) نقصان کے اندیشے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

تعلیم سے فراغت اور ملازمت کے حصول کے فوراً بعد ۱۵ جون ۱۹۳۶ء کو مشتاق احمد یوسفی نے فلسفہ میں ایم اے تک پہنچی لکھی اور اہل زبان خاتون اور پرنس قلم سے اپنی پسند کی شادی کی۔ (۳۱)
مشتاق احمد یوسفی کے شہر محترم مظفر احمد خان نیک اور دین دار انسان تھے جو ہندوستان میں جج کی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ ۹۰-۱۹۹۸ء میں سے کسی سال محکوم احمد خان کا انتقال ہوا۔ مشتاق احمد یوسفی کے برادر شعی منصور احمد خان وکیل تھے اور کراچی میں اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں میں کافی معروف ہوئے۔ یہ لوگ بنیادی طور پر آگر و شریف کے رہنے والے تھے۔ (۳۲)

پسند کی شادیوں میں مسائل زیادہ ہوتے ہیں، تاہم مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے اور پرنس قلم کے ساتھ ایک مثالی ازدواجی زندگی بسر کی ہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں کہیں ان کی اہلیہ کا ذکر آیا ہے، شکر آمیز محبت کا لہجہ غالب ہے۔ ان انتہاسات میں محبت، درود اور شغاف کی ایسی آمیزش ہے کہ اکثر آنکھیں چمک نکلتی ہیں۔ (۳۳)

اللہ تعالیٰ نے مشتاق احمد یوسفی کو چار بچوں سے نوازا ہے، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام راشد یوسفی اور چھوٹے کا سروش یوسفی ہے بڑی بیٹی کا نام رشانہ اور چھوٹی کا سہا ہے۔ ساری اولاد شادی شدہ ہے دونوں بیٹے ارشد یوسفی اور سروش یوسفی انجینئرز جب کہ دونوں بیٹیاں رشانہ اور سہا ڈاکٹر ہیں۔ ارشد یوسفی انجینئرنگ میں اور اپنے بچوں کے ساتھ امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ جب کہ سروش یوسفی مینیجنگ انجینئر ہیں اور والد کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی بڑی بیٹی لیڈی ڈاکٹر رشانہ مانچسٹر (Manchester) کے قریب ایک سرکاری ہسپتال میں ایم

آر پی (MRCP) (۳۴) اور ان کے شوہر ہیں، جنرل فزیشن ہیں۔ یہ لوگ وہیں مستقل انعامت پذیر ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر سہا مایر امراض جلد (Skin Specialist) ہیں اور کراچی ہی کے ایک ہسپتال میں Consultant ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد سب کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ اردو زبان اور ادب کے اس لیے مثال ادیب اور دانش ور کے انکار اور اسلوب عالی کی تعلیم تو ان کے لیے بڑی بعد کی بات ہے وہ تو ان ادیب ساڑتسائی کی محض خواندگی (Just Reading) کے بھی قائل نہیں ہیں۔

قد رت دیکھئے جس سنج علم و ادب یوسفی سے مجھ جیسوں نے بھی فیض پایا۔ اُس سے اُن کی اپنی اولاد بخیر و برکت ملی۔ تاہم ان سناج کا مددگار و قصور وار وہ اپنی اولاد کو نہیں سمجھتے، اس کے سبب وہ بڑی فراخ دلی اور وسعت نظری سے کچھ اپنی مصروف زندگی کے شرارت اور کچھ جدید عہد کے تقاضوں کے اثرات شمار کرتے ہیں۔ (۳۵)

بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد مشتاق احمد یوسفی نے کراچی کو اپنا مقرب منتخب کیا اور ۱۹۵۰ء سے تاحال کراچی میں مقیم ہیں۔ اس عرصے میں اپنی ملازمت کے باعث انہوں نے نو برس (۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۳ء تک لاہور میں اور گیارہ برس ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک لندن میں گزارے تاکہ ان کی باقاعدہ سکونت اور مستقل محبت کراچی ہی سے متعلق رہی۔ (۳۶)

مشتاق احمد یوسفی کے ۸۳ سالہ عرصہ حیات میں، جن ممالک کو ان کی زیارت کا شرف میسر آیا ان میں عرب امارات، قطر، بحرین، عراق، لبنان، (یروشلم)، ایران، عمان، سعودی عرب، اٹلی، فرانس، جرمنی، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، ساؤتھ افریقہ، زمبابوے اور لندن شامل ہیں۔ انہیں اسلام میں تجاویز مقدس کا سفر بھی شامل ہے ۱۹۸۲ء میں انہیں حج کے فرض کی ادائیگی کا موقع ملا اور تین چار بار عمرہ کرنے کی سعادت سے بھی نوازا سے گئے۔ ۱۹۹۵ء تک انہیں جاپان اور چین جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ جس کی انہیں اب کوئی حسرت بھی نہ تھی۔ (۳۷)

اگر مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کا یہ غور مطالعہ کیا جائے تو علم ہوگا کہ انہوں نے خود کو لاحق بیماریوں کا بھی ہتھے پہنچے اور مختلف انداز میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مختلف اندازوں پر بھی اس موضوع پر بات کی گئی ہے وہ بلاشبہ اتنے حساس Conscious ہیں کہ اپنے متعلق تقریباً ہر بات کا ذکر اپنی تحریر

میں کر دیا ہے۔ حیرت ان کے اس اصرار پر ہے کہ حالات زندگی فن کار کے فکرو فن پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔

یونانی کی کمزوری معدے کی تکلیف اور دل کا پانی پاس (By Pass) وہ خاص پہلو ہیں جو اشتیاق احمد یوسفی سے متعلق ہیں۔ چھپے چائیس برسوں سے وہ معدے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ شروع میں وہ اسے اسر Ulcers خیال کرتے اور اپنی تحریروں میں اسی کے متعلق بتاتے رہے۔ تاہم لندن میں تفصیلی طبی معائینوں کے بعد انہیں پتہ چلا کہ یہ اسر نہیں۔ بلکہ ایسوفی جائیس Esophagegyliss ہے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں دل کے دورے کا بھی ذکر کیا (۲۸) حالانکہ انہیں دل کا دورہ کبھی نہیں پڑا۔ البتہ لندن میں ہی دل کے معائنے کے دوران میں انہیں پتہ چلا کہ دل کی ایک رگ بند ہے اور کسی بھی وقت دل کے شدید دورے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لیے لندن سے واپسی سے قبل ستمبر ۱۹۹۰ میں دل کی پانی پاس By Pass اتنی بھی کروائی گئی جس میں ان کی دو رگیں بدل گئیں:

”دن رات کے بعد لندن میں آٹھ سو سینے پر اب اس لیے کہ گھٹے اپنا فائیت چننا تھا

اور دل کا Operation کروانا تھا تو ستمبر ۱۹۹۰ میں دل کا By Pass

ہوا (۲۹) ۱۵ دسمبر ۱۹۹۰ کو پاکستان واپس آگیا اور اس کے بعد پھر میں نے پیشہ وارانہ

کام نہیں کیا اس لیے کہ مجھے یہ کہنا پڑا تھا کہ اب پاؤ آپ Professionally

Active ہیں اور اگر کہیں پڑھنے کا آپ کا شوق ہے تو وہ کریں لیکن دلوں کا کام آپ ایک

دقت نہیں کر سکتے۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ جو کچھ کھانا کھانا تھا وہ ہو چکا ہے اب جو تھوڑا

بہت وقت چاہتا ہوں دیکھتے پڑھتے میں گزار دوں تو اس کے بعد کسی کام کی طرف رخ

نہیں کیا (۳۰)

یہ رائے مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت کو دیکھنے میں بہت معاون ہے۔ عام انسان میں عمر کے اٹھانے کے ساتھ ساتھ زندگی اور مادی ضروریات کی بوس بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور ایسے میں اگر ہر سہولت سے متحصص ہونے کے مواقع بھی میسر ہوں اور انسان پھر بھی اپنا دامن بچالے جائے تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ مگر بڑے رواج اور دنیاوی دھن دولت پر ثروت فکرو نظر کو ترجیح دینا مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت کا نہایت مشہور پہلو ہے ایسا تو کل خوش نصیبوں کو عطا ہوتا ہے مگر چاس سارے عمل میں انسان کا اپنا اخلاقی شخصی فکری نظام نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس طرز مہیات کے پیچھے

کبھی کبھی کچھ خوب صورت و خوب سیرت شخصیات کی صحبتوں کا فیض بھی شامل حال ہو کر رہتا ہے۔ یہ قول صاحبزادہ مجین نظامی (۵۱):

یہ انہی علم و دانش کی ٹینیں ہیں

یہ قیصران فکر ہے لعل اناس

یہ تاخیر کتب خانہ نہیں ہے

یہ صحبت کا اثر ہے لعل اناس

ہر شخص زندگی میں چند ایک شخصیات کو پسند کرتا اور ان سے متاثر ہوتا ہے، پھر ان شخصیات کا اثر شعوری اور لاشعوری طور پر اس میں سرایت کرتا رہتا ہے (۵۲) ایک شخصیت خود جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کے اندر اثرات کا تنوع بھی اسی قدر ہر جہت اور ارفع ہوا کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی شخصی زندگی میں تین شخصیات کے حلقہ اثر میں رہنے کا حوالہ دے افسانہ فخر اور محبت سے دیا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اپنے والد عبدالکریم خان یوسفی، پھر مسلم یوسفی درشتی علی گڑھ میں اپنے ام اے قسطنط کے استاد ڈاکٹر ظفر احسن اور تیسرے اپنے ایک دوست میاں فضل حسن۔ اپنے والد کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”میں اپنے والد سے متاثر ہوا اس معنی میں کہ میں نے ان کو کبھی جھٹ بولنے

نہیں سنا۔ وہ بہت بڑا اور صباک آدمی تھے۔ عجائبات کہنے میں دو گھنٹا بچکاتے نہیں تھے۔

انہیں خسر بہت جلدی آتا تھا کمزوری بھی کہہ سکتے تھے، مجھ میں بھی ہے لیکن میں نے ان کو

بہت راست باز اور اپنے عقائد میں اور اپنے سیاسی عمل میں بہت علی حاد، مستقل مزاج اور

استقامت رکھنے والا آدمی پایا ہے۔ بہت سی سادہ زندگی تھی ان کی۔ انہوں نے مجھے بہت

متاثر کیا۔ (۵۳)

کسی حد تک وہ اپنے خسر محکوم احمد خان سے بھی متاثر ہوئے لیکن حقیقی معنوں میں اپنے والد ہی سے متاثر رہے۔ ان سے اثر قبول کرنے کی بڑی وہیدان کا راسخ العقیدہ اور پابند شرع مسلمان ہونا ہے، یہ دل کے کمرے اور زبان کے پیک لوگ تھے، ایسے پاکیزانوں کی صحبت کے دل پزیر اثرات کا اندازہ ہر خاص و عام ہا آسانی لگا سکتا ہے ایک اور حوالہ بھی فضل کے لائق ہے:

”میری والدہ بہت اچھی لڑکی تھیں۔ جب میں اپنے باپ میں جھانک رہا تھا تو میں

بہترین تھے، فیال بھی بہترین تھے، سب کچھ جمع کر دیا تھا مگر ہمارا اس میں کچھ بھی نہ تھا۔
 سوائے زبان کے زبان کی داد و ذکر صاحب نے ہمیں دے دی، تو وہاں سے ہمارا عوام
 رہ چکے تھے اور سوچنے کے بارے میں بدل چکے تھے۔ انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ کوئی اور استاد ہونا تو
 بڑی دہشت ہے۔ تو وہ جس انجام میں جاتے تھے وہی ذکر صاحب سے نہ بچ سکتے تھے، انہوں نے
 بہت کچھ یاد اللہ انہیں فریقِ رحمت کرے۔ (۵۵)

محض اپنی ہی ذات میں محدود ہو کر انسان زندگی کا سارا حسن کشف نہیں کر سکتا، اس لئے دوستی کی
 اہمیت اور افادیت زندگی کے کسی مرحلے پر بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی اور ایسے شخص کے مفلس ہونے
 میں کیا شک ہوتا ہے، جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ دیگر شعبہ ہائے حیات کی مختلف النوع شخصیات کی
 طرح انسان زندگی میں اپنے دوستوں کا بھی بے حد اثر قبول کرتا ہے، بظاہر یہ اثر دکھائی نہیں دیتا لیکن
 در پردہ دوستوں کا حلقہ اثر غلامانی تاخیر کا حامل ہوتا ہے۔ میاں فضل حسن، مسرت علی صدیقی، شیخ
 منظور الہی، جی رحیم، ذاکر آفتاب احمد، مسعود مفتی، ڈاکٹر ضیاء الدین خلیب، افتخار عارف، نور الحسن
 جعفری، امین الفتوح، شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، سید حمیر جعفری یوں تو مشفق احمد یوسفی کے دوستوں
 میں شامل ہیں۔ لیکن ان میں کچھ گہرے دوست ہیں، کچھ سے تعلق خاطر اور کچھ سے چند ایک
 علاقہ تھیں ہیں۔ تاہم میاں فضل حسن جو جینیوٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کی محبت اور ذہانت سے
 حقیقی معنوں میں مشفق احمد یوسفی بہت متاثر ہوئے۔ ان کی اکثر گفتگو اور اعتراضات میں میاں فضل حسن کا
 ذکر آتا ہے، ”آپ تم“ کے دیا ہے میں بھی ان کا بڑا اتنا ناز کر رہا ہوں ہے۔ (۵۶)

اگرچہ مشفق احمد یوسفی نے مسرت علی صدیقی کا اس علم میں بہت زیادہ ذکر تو نہیں کیا، لیکن
 مسرت علی صدیقی سے بھی وہ بہت متاثر ہوئے، یہ اس لئے کہ ”آپ تم“ میں ”بشارت“ نام سے جو
 کردار انہوں نے تخلیق کیا، وہ مسرت علی صدیقی ہی کا ہے۔ ایسا جاندار کر دہا شدہ متاثر ہوئے بغیر
 تخلیق کرنا یقیناً ممکن نہیں۔ (۵۷)

سامانی شخصیات میں کوئی خاص شخصیت ایسی نہیں ہے جس نے انہیں متاثر کیا ہو، اہمیت:

”عزت کرتا ہوں جو لوگ کام کر رہے ہیں، اچھے ایڈمی صاحب یا اختر عید خان
 صاحب ہیں اور جی پائٹ پرائیکٹ والے یا ادرہ اسلام آباد میں بیورو ایڈیٹرز انٹرن کی
 اختر رضا الدین صاحب ہیں، انہیں بھی جی تو یہ بڑے لوگ ہیں۔“ (۵۸)

محسوس کرتا ہوں کہ مجھ پر ان کا بہت اثر ہے۔ غالباً یانہیں کی حس مزاج، مگر سے متاثر ہے
 اور کون حوالی کا اثر ان کے بیٹے پر ہوا۔“ (۵۹)

شخصی اعتبار سے نہ کسی لیکن علمی اور ادبی لحاظ سے اس رائے کی بڑی اہمیت ہے اور اسے کسی طور
 پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایسا قطعاً ضروری نہیں کہ مشفق احمد یوسفی کی والدہ خود بھی تخلیقی ادب
 سے باقاعدہ وابستہ رہی ہوں تاہم ان کے اندر تخلیقی خواص جو کسی ایک آج کے منتظر تھے، ہو سکتا ہے کہ
 اگلی نسل میں اپنی تکمیل کے مراحل طے کر کے مشفق احمد یوسفی میں مکمل طور پر صورت پذیر ہوئے
 ہوں۔ حیات جاتی نظام کے پیش نظر اگر نسل در نسل ہونے والے خواص کے نظریے پر غور کیا جائے تو یہ
 اشارہ مشفق احمد یوسفی کی گفتگو نگاری پر والدہ کی طرف سے مرتب ہونے والے اثرات کی بہترین
 تفسیر کرتا ہے اور ان سے صرف نظر کرنا قرین انصاف نہیں۔

مولہ سترہ برس کے تعلیمی دور اپنے میں یقیناً ایسے استاد بھی زندگی میں ضرور آتے ہیں جو کسی
 ایک پیلوڈ سے انسان کو مرعوب و متاثر کرتے اور مرعوب و معین بنھتے ہیں۔ مشفق احمد یوسفی
 استادہ میں سے ذاکر نظر الحسن سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ذیل میں جو رائے نقل کی جارہی
 ہے، یہ مشفق احمد یوسفی کی تصور فکر کو سمجھنے میں بھی بے حد معاون ہے:

”سب سے زیادہ متاثر تو میں ذاکر نظر الحسن صاحب سے ہوں۔ ذاکر نظر الحسن
 صاحب اس زمانے میں ملی نژاد یونیورسٹی میں فلسفے کے جنرل میں تھے۔ رہنے والے غالباً
 جملک تھے۔ ان سے زیادہ Sharp اور Analytic دماغ میں نے کسی کا نہیں
 دیکھا۔ کوئی بات سوائے کی وہ ایسی حقیقت اور چھان چلک کرتے کہ حیرت ہوتی اور ایک نئی
 روشنی ملتی تھی۔ بہت ہی ذہین اور خوبصورت آدمی تھے۔ سفید داڑھی تھی، بڑی نورانی۔ مجھے
 یاد ہے کہ انہوں نے کسی موضوع پر نیوٹرل میں لکھنے کو غالب طوں سے کہا۔ ہم سب لکھ
 کر ایک ایک مضمون لے گئے۔ میں نے بڑی محنت سے مضمون لکھا مگر بڑی ہی میں۔ تو لوگ
 حائلے لگے میری باری آئی تو میں نے سنا۔ بہت خوش ہوئے کہنے لگے کہ صاحب یہ
 بتائیے کہ یہ جو آپ نے مضمون لکھا خوبصورت لکھا ہے، اس میں کوئی بات ایسی ہے جو آپ
 نے پڑھی نہیں ہے کہیں بھی اور صرف آپ نے لکھی ہے تو وہ بات، وہ نقطہ وہ جملہ بتائیے
 ۔ اب ہم تم، اس لئے کہ وہ ہم نے کتاب میں سے پڑھ کے لکھا تھا۔ اس میں جملے بھی

انگریزی ادب میں زیادہ پسندیدہ لکھنے والے مارک ٹوین (Mark Twain) ہیں۔ اسٹیفن لیکاک (Stephan Leacock) سے بھی متاثر ہیں اور اردو ادب میں غالب کے اثرات ان کے غزلیوں پر زیادہ غالب دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ اردو کے تقریباً تمام مستند ادیبوں کی عقل ان کے ہاں دکھائی دیتی ہے، جو کسی کرامت سے کم نہیں۔

کسی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے لئے جہاں اس کے دوستوں اور عزیز واقارب کی گواہیاں محدود معاون ثابت ہوتی ہیں وہاں اس کی ذاتی پسند و ناپسند اس کے مشاغل، اس کی سوچ، فکری تضادات غرضیکہ تمام اسلوب حیات زیر بحث آتا ہے۔ لیکن پسند و ناپسند کے متعلق مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتابوں اور انٹرویوز میں گاہے گاہے پردہ کشائی کی ہے۔ ان کی سوانح اور شخصیت کی بہتر تفہیم کے لئے اس سوانحی خاکے کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے جو ہم نے اس سے قبل ان کی تحریروں سے ترتیب دیا ہے۔ یہاں اس خاکے کا ایک ناکافی اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”میں نے ذرا رنگ، خوشبوؤں میں معرکہ استعمال کرتے ہیں فوٹو گرافی اور

جانور پالنے کا مطالعہ، رنگ بھانسنے دکھانا۔ پتھر جانوروں میں توں سے بہت زیادہ کرتے ہیں، البتہ لی سے انہیں کوئی رشتہ محسوس نہیں ہوتی۔ ۱۹۶۳ء میں ایک بندر بھی ملا جس کا

نام رہا سائے اقامت، ڈاؤن راکھا۔ (۵۹)

خوشبو، مرغیاں اور مٹھا بھی پالتے رہے۔ ۱۱ اور ان کا پسندیدہ شہر ہے تاجم کراچی سے انہیں اس لیے بہت محبت ہے کہ یہاں ان کا رزق اتر اتر اور ”جہاں سے ذوق ملے“ اس جگہ سے، وہاں کے لوگوں سے محبت کرنی چاہتے رہے۔ Nostalgia میں جتنا ہو جاتا ہے۔“ (۶۰)

گھر میں شلواریں نہیں میں رہتے اور اس لباس کو پسند کرتے ہیں۔ باہر البتہ پینٹ کوٹ پہنتے ہیں۔ شراب نہیں پیتے، البتہ کافی کے زمانہ طالب علمی سے ۱۹۷۹ء تک سگریٹ نوشی کرتے رہے ہیں۔ لندن جانے کے بعد یہ کفر بھی ٹوٹ گیا۔ کتابوں سے عشق کرتے ہیں۔ جلدی ٹیٹھ میں آ جاتا ان کی شخصیت کی خامی ہے۔ ایک خامی اور بھی ہے، غلط کا جواب نہیں دیتے۔ اپنی ذات کی حد تک تو ہم بھی اس امر کی گواہی دے سکتے ہیں۔

نہایت خوش ذوق آدمی ہیں۔ ان کی خوش ذوقی کا اندازہ ان کے ڈرائنگ روم سے بھی ہوتا ہے، (جہاں بیٹھ کر ہم نے ان سے انٹرویو کیا) خوبصورت اور نفیس Paintings، پورا روم کے ساتھ

آؤچہ اس ہیں۔ کچھ مرد چٹائی بھی کھولیں دیکھی ہیں (۶۱) اور ہر صورتی کے سامنے چائے لائٹ رکھی ہے جو ان مورچوں کو ہم روٹن کر کے چپ رہا تو ہی افسانہ پیدا کرتی ہیں۔

۱۹۹۵ء میں ان کے ایک ڈرائیور، ملا اور خان ہوا کرتے تھے۔ (۶۲) ان سے بھی ہماری گفتگو ہوئی تھی۔ ملا اور خان نے بتایا تھا کہ صاحب (مشتاق احمد یوسفی) بہت ہی اچھے اور مہربان آدمی ہیں۔ گھر کا سارا حساب کتاب اور گھر چلانے کا کام بڑی نظم و ضبط (اور یس فاطمہ) کرتی ہیں۔ صاحب اور بیگم صاحبہ انتہا دل پسند ہیں۔ مکتبہ و انپائل (کراچی) کی مائٹروپولیٹن نورانی نے بتایا کہ بڑی صاحب بہت ہی مہربان اور خوش دار آدمی ہیں۔ جب میرے والد ملک نورانی سرطان (Cancer) کے مرض میں مبتلا ہو کر کمرہ ۱۹۸۹ء میں ڈاکو (امریکہ) کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ تو بڑی صاحب لندن سے ہر لڑھے ڈاکو فون کڈ رہے تھے۔ بیمار پریشی فرمایا کرتے تھے (۶۳)

کرمل محمد خان راقم کے ۲۴ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”مہربان، مجلس، خلق، خوش مزاج، نہایت ہی پیارے اور مہربان آدمی ہیں۔ آخر

کوئی خامی ہے (اور!) نہ ہوگی، تو مجھے اس کا علم نہیں تھے تو ان میں کیے ہوئے دیگر دونوں خرابیوں اور نفرتیں، خاص دوستوں میں کبھی کبھار کی طرف سے ہیں۔ ویسے کم گو ہیں۔“ (۶۴)

ان کے قریبی دوست، سرست علی احمد یوسفی ان کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ایک مطبوعات میں مطر غلام پندرہ کرتے ہیں، چنانچہ ان کے دوستوں کو ان کی دوستی میں شہرت اور مہربانی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنی جگہ جیروں کے علاوہ ایک ایسی بات، بڑا اور صاحب کے، گاہ ہیں کہ مکمل کو اپنی فضا، جاتی اور مزاج کی آمیزش سے دھڑکنے لگتے ہیں اور یوں دیکھتے تو وہ نہایت ہی مہربان اور ہمدرد، انجیو، قہریت کے حامل ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ وہ صرف ان کے لیے اکتفا، احباب کی ہی کمالات میں نظر آتا تھا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی انصافیت ہے، جو سے جڑ سے جڑوں پر کھینچنے کے بعد بھی وہ اپنے قدیم دوستوں کو نہیں بھولے اور آج بھی اسی گروہ کی اور افعال سے رہتے ہیں، جیسے اُن کی

اپنے کیرئیر کی ابتداء میں مل کر رہتے تھے۔“ (۶۵)

سید عزیز بھٹری انہیں اردو کے مسکراتے ہوئے قلبی کا خطاب دیتے ہوئے ان کی فہرست یوسفی

حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر بھی بڑی عمدہ گفتگو کرتے ہیں:

”دوست داری ان کی شخصیت کی بڑی حکم اور بڑی ہی رو دکھائی چھاپ ہے۔ دوست ہائے وقت دوست کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں اور دوست ہانسنے کے بعد دوست کی طرف سے دونوں آنکھیں بند کر پڑتے ہیں۔ اپنے ماحول حراں نگاہوں میں ہر وقت کسی نہ کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ اپنے ہارے میں ہاگوار باغ میں خندہ چوٹی سے ملتے ہیں“ (۶۹)

شان الحق حقی کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آکسفورڈ لغت کا اردو ترجمان کا قابل قدر اور یادگار کام ہے۔ دیکھئے یوسفی صاحب کی کیسی دل آویز تصویر کھینچتے ہیں:

”یوسفی صاحب کی شخصیت ہر طرف سے اتنی محکم ہے کہ مجھے اس میں کہیں بھی کوئی جھک کوئی بھول کوئی لنگ نہ نہیں آتی۔ ہر کی فکر کا قصہ بھی ہو سکتا ہے، ہر ان کی نظری طرح میں نہیں، بلکہ ان کے پارکھ دیکھ لیتی ہے۔ لاموجود کو موجود کر دکھاتی ہے اور ان کے کہنے کو ماننا پڑتا ہے۔“ (۷۰)

مشتاق احمد یوسفی کو بہت قریب سے جاننے والوں نے ان کی حق گوئی، پرہیز گاری اور ان کے پابند شرع ہونے کے بھی اشارے دیے ہیں مثلاً ان کا عارف صاحب نے ہماری کتاب ’ایضافیات‘ کا فنی نسخہ پڑھ لینے کے بعد جب اسے ظلم بند فرمائی تو ایک اضافی خط لکھتے ہوئے اس امر کی طرف ہماری توجہ دلائی کہ ہم نے مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت میں تقویٰ کے پیلو کو زیادہ واضح نہیں کیا۔ یہ بات بذات خود مشتاق احمد یوسفی کی پرہیز گاری کا واضح اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں فکری اعتدال اور بے تنسی کا وصف بھی بہت نمایاں ہے۔

”ہم نہ صرف اعتدال میں رہنا چاہتے ہیں۔“ (۷۱)

اختیارات کا جادو سر پہ نہ کر بولتا اور آکر سر لے کر اترتا ہے، کیوں کہ کار بھیاں گیری و کار فقیہی سے دشوار ہو کر رہتا ہے۔ اختیار و اقتدار کا نشا و جانہ اچھوں کے ہوش و حواس کا قائل ثابت ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ اس اعتبار سے کافی غیر معتبر اور ناقابلِ فخر ہے اور اس ضمن میں کسی مثال کے بغیر بھی کام چلا جاسکتا ہے۔ شروع میں ذکر ہوا کہ مشتاق احمد یوسفی نے مجسٹریٹ، ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل کمشنر کے بااختیار عہدوں سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور دسمبر ۱۹۳۹ء میں محض اس وجہ سے تمام

عہدوں کو اتار کر پاکستان چلے آئے کہ اب وہاں کی سرکاری زبان اردو نہیں رہی۔ آئے بھی کیے، خالی ہاتھ اور وہ بھی اوٹ کی کوپاں پر بیٹھ کر (۶۹) زبان اردو سے ایسی محبت ہم میں سے کتنوں نے کی ہے؟ بہر حال یہ استغناء بھی ان کے حراج میں رہتے ہیں۔ درویشانہ اسلوب اور تقویٰ کی دلیل ہے۔ تاہم مشتاق احمد یوسفی کا پابند شرع، راسخ العقیدہ اور پرہیز گار ہونا اس امر سے بھی واضح ہے کہ ان کو نہ ڈر کرنے والی شخصیات حق گوئی اور تقویٰ میں بے مثال تھیں۔ کھڑے حق کہنے کا وصف ان کے بالِ موراٹی تو ہے ہی، انسانی بھی ہوگا۔ انہیں ان کی ادنیٰ خدمات کے عوض جو اعزازات مہر آئے، ان کے ساتھ معقول رقم بھی شامل ہوتی ہیں مثلاً کمال فنی ایوارڈ کے ساتھ پانچ لاکھ روپے کا چیک دیا گیا کیا اس رقم کا تو ہمیں پتہ نہیں، لیکن ہلال امتیاز کے ساتھ ملنے والی کثیر رقم انہوں نے ایسی ہی واپس کر دی اور شوکت خانم میموریل ٹرسٹ کو عطیہ کر دی، اس سے بھی ان کے تقویٰ کے پیلو کو تقویت ملتی ہے۔ اسی طرح بی بی آئی (لندن) سے ریٹائرمنٹ اور دل کی سرجری کے بعد ان کا پیشہ دارانہ مصروفیات کے مقابل میں اور ادبی مشاغل کو ترجیح دینا بھی، ان کی شخصیت کے اسی پیلو کا عکس پیش کرتا ہے۔

ایک انسان کی حیثیت سے مشتاق احمد یوسفی قابلِ رشک شخصیت کے مالک ہیں، اگر درج بالا تمام پیلوؤں کو سامنے رکھا جائے اور ان کی نفسیاتی (Psychological) توجیہ و توضیح کی جائے تو یہ جاننا ان کی شخصیت اور کردار کے کئی فنی گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

جنابی یا اصول اور کمال پسند (Perfectionist) مشتاق احمد یوسفی، پاکیزہ و سوجھ اور انتہائی نفس خیاالات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ شفیق، ملسار، رحمت کرنے والے، ہمدرد، جھنجھکی، خوددار، پابند شرع، پرہیز گار، راسخ العقیدہ، حق گو، منکر و معتدل مزاج اور وضع دار و قاضی انسان ہیں۔ انہیں قصہ بہت آتا ہے۔ ان کی تحریروں سے انسان دوستی اور ہمدردی کے آثار شدت سے ابھرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ یہ سب ہوتے ہمدردی کے احساس کے باعث انسان کو قصہ بہت آتا ہے، یوں شدید حساسیت اور زور زنجی کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، تاہم عظیم الطبع اور بردبار ہونے کا وصف انہیں اس مشکل سے بھی سلاحتی اور سہولت سے نکال لے جاتا ہے۔

سرت علی صدیقی (جن کا قلمی نام سرت علی سرور ہے) نے اپنے شعری مجموعے ’نوائے بے نوا‘ میں مشتاق احمد یوسفی کے لئے تین نظمیں کہی ہیں، یہ نظمیں بھی مشتاق احمد یوسفی کی پرکشش اور

جاؤ ب نظر شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔

مشتاق احمد یحییٰ نے اسکول کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن اسے محض ریاض اور منطق خیال کرنا چاہیے، باقاعدہ لکھنے کا آغاز تعلیم مکمل کر لینے کے بعد انہوں نے اپنے لئے خود کیا (۷۰ء) اور ضرور کیا جاسکتا ہے کہ ان کے انداز تحریر و تقریر میں ڈاکٹر حفص الرحمن کے رویے کا خاص عمل دہل ہے، جس کا حوالہ گزشتہ صفحات میں دیتے ہوئے گزشتہ اورش کی گئی تھی کہ اسے مشتاق احمد یحییٰ کا نظریہ فن تصور کرنا چاہئے۔

مشتاق احمد یحییٰ نے اپنے ادبی کیرئیر کا آغاز "مشتاق احمد" کے قلمی نام سے کیا اور اس کی وجہ ادویٹک کی ملازمت بیان کرتے ہیں، یہاں ان کی اپنی رائے سے استفادہ کرتے ہیں:

"Banking" کی وجہ سے مجھے آپ میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی، لیکن ادب کی وجہ سے مجھے Banking میں بہت تکلیف ہوئی اور جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ ان مشیوں میں جیسے Banking ہے، Engineering ہے، Insurance ہے، ان میں Intellectual آدمی کو انہی امور سے نہیں دیکھتے۔ اس سے بڑی کالی ان مشیوں میں کوئی ہے ہی نہیں۔ ڈاکٹر نوشی انہی دسی کہ میرے بارے میں بہت بعد میں پتہ چلا کہ میں لکھنا بھی بوجھ تھا میں پہلا "مشتاق احمد" کے نام سے لکھتا تھا اور بینک فاکل میں "ایم اے کے جوائی" درج ہے۔ تو "چراغِ سبز" آنے کے بعد پورا نام میرا واضح ہوا لوگوں نے۔ اس وقت تک میں اپنے پیشے میں کافی ترقی کر چکا تھا اور پھر میرا کچھ آسانی سے کوئی بکا نہیں سنا تھا۔" (۷۱ء)

"صوبہ لاغر" مشتاق احمد یحییٰ کا پہلا باقاعدہ مکتوبہ مضمون ہے، جو طباعت کے لئے سب سے پہلے معروف ادبی جریدے "ماہنامہ ادب لطیف" لاہور کو ارسال کیا گیا، جس کے مدیر اُن دنوں میرزا ادیب ہوا کرتے تھے۔ میرزا ادیب کو مضمون کے مرکزی خیال سے اتفاق نہیں تھا، اس لیے یہ مضمون مشتاق احمد یحییٰ کو معذرت کے ساتھ واپس ارسال کر دیا گیا۔ پھر ترقی پسند خیالات کے حامل رسالے "ماہنامہ سورا" لاہور کو یہ مضمون ارسال کیا گیا، جس کے مدیر لطیف رائے تھے، انہوں نے اس مضمون کا بڑا مثبت اور حوصلہ افزا جواب ارسال کرتے ہوئے مشتاق احمد یحییٰ کو مزید مضامین لکھنے کی بھی تاکید کی۔

یوں مشتاق احمد کے نام سے ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ "سورا" لاہور سے مشتاق احمد یحییٰ کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز ہوا اور نصف لاغر مکتوبہ مضمون کے طور پر شائع ہوا۔ اس کے بعد ماہنامہ "سورا" ہی میں یا ترتیب ان کے مضامین چار پائی اور پھر، کمرٹک اور کاغذی یہ سیر بن شائع ہوئے (۷۲ء) "مشتاق احمد" کے نام سے سات روزہ نصرت کے پرچے میں بھی ایک مضمون "موسمِ شام، شائع ہوا (۷۳ء) "صوبہ لاغر" کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی جریدے "ماہنامہ افکار" کراچی میں ان کے مضامین تو نے بی بی نہیں، ماہ نامہ لاغر میں مریوں کا اور "جون لطیف" یا ترتیب سے شائع ہوئے (۷۴ء) یہ آٹھوں مضامین لاغر کافی کے بعد ان کی پہلی کتاب "چراغِ سبز" میں شائع ہوئے۔ تو نے بی بی نہیں کا نام بدل کر کافی رکھ دیا گیا۔ ادبی حلقہ ادبی دنیا، جو مولانا صلاح الدین لاہور سے نکلتے تھے، اس میں بھی ایک مضمون ہوئے سر کے ہم جوسوا (۷۵ء) اور احمد ندیم قاسمی کے جریدے "ماہنامہ افکار" لاہور میں ایک مضمون "پندرہ تصویریں" شائع ہوا (۷۶ء) بعد ازاں یہ دونوں مضامین قطع و برید کے بعد ان کی دوسری کتاب "خاکہ بر بن" میں شامل ہوئے۔ ان مضامین کے بعد انہوں نے رسائل و جرائد میں اپنے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ قطعی طور پر بند کر دیا۔ بہت دیر بعد روزنامہ "بینک" کراچی کے ادبی ایڈیٹروں میں ان کا مضمون "عربی سچ" اقساط میں سلسلہ وار شائع ہوتا رہا (۷۷ء) بعد میں یہ مضمون ان کی چوتھی کتاب "آبِ گم" میں ایک پارے باب کے طور پر شائع کیا گیا۔

جوبی طور پر مشتاق احمد یحییٰ نے رسائل و جرائد اور اخبارات کے لئے بہت کم لکھا ہے۔ وہ کسی اخبار کے لکاب کا نام سے بھی وابستہ نہیں رہے کہ جہاں محض کائنات کا بیٹ بھرنے کے لئے بہر حال کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے، البتہ مختلف تقریبات کے لیے انہوں نے فرمائشی مضامین ضرور لکھے اور عوام کے ذوق اور حماقت کو ٹوٹا ناظر بھی رکھا، لیکن اپنے معیار کا دامن پھر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہ تقریباتی مضامین ان کی کتابوں کا حصہ نہیں بنے اور نہ ہی کسی ٹیلیوڈ کتابی صورت میں تدوین و طباعت کے مراحل سے طے حال کر گزرے ہیں۔

۵ دفروری ۱۹۶۱ء کو مشتاق احمد یحییٰ نے پہلا حلقے کے نام سے اپنے مضامین پر مشتمل پہلی کتاب کا مقدمہ لکھا اور ۱۹۶۱ء میں ۳۸ سال کی عمر میں ان کی پہلی کتاب "چراغِ سبز" زبور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ (۷۸ء) یہ کتاب پہلے "پہل" مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوئی اور پھر اس کتاب کو مکتبہ دانشگاه کراچی کے پبلیٹ قائم سے شائع کیا گیا۔ اس ادارے سے اب تک اس کتاب

کی کیا رواشائیں عمل میں آچکی ہیں۔

’چراغ تلے‘ میں شامل مضامین کو انہوں نے ’مکتبہ صفیہ‘ کہا ہے اور ان پر کسی خاص صوبہ ادب کی مہر ثبت نہیں کی (بعد میں ان مضامین کو انشائیے کہا گیا، جو کہ درست نہیں) ’چراغ تلے‘ کا انتخاب ’والد مرحوم‘ کے نام ہے چراغ تلے میں بارہ مضامین شامل ہیں جو چارے گزشتہ کافی یادیں، یونیورسٹی، میوزیم، لائف، چارپائی اور پتھر اور آگھر میں مریضوں کا کرکٹ منگ لائے موسموں کا شہر اور کاندھلی ہے پھر جن کے عنوانات اور ترتیب سے موجود ہیں۔ ان میں سے آٹھ مضامین سویرا لاہور نصرت لاہور اور افکار کراچی میں شائع ہوئے۔

’چراغ تلے‘ کی اشاعت کے ۹ سال بعد ان کی دوسری کتاب ’خاکم بدین‘ جنوری ۱۹۷۰ء میں ’مکتبہ اردو ڈائجسٹ‘ میں آباد لاہور سے شائع ہوئی، جس کا مقدمہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو دست زلیخا کے نام سے مکمل ہوا۔ بعد میں اسے بھی ’مکتبہ ادبیات کراچی‘ سے شائع کیا گیا۔ ’خاکم بدین‘ میں آٹھ مضامین شامل ہیں جنہیں انہوں نے ’خاکے اور حرائے‘ کا نام دیا۔ ’خاکم بدین‘ میں صلیب، اینڈر سٹریٹ، سینٹر، مائٹری اور مرزا ہارے آلو کا کچھ بیان ہو جائے، پروفیسر ہوئے سر کے ہم جو رواں، انکشن، ہائی وکیل کلب اور چند تصویریں شامل ہیں مکتبہ ادبیات کراچی کے تحت یہ کتاب اب تک چودہ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے اپنی زبردست سہ اور پس فاطمہ کے نام ’منسوب کیا‘ خاکم بدین کو ۱۹۷۰ء میں آدم بی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جو بقول شخصے آدم بی ادبی ایوارڈ کی جوسٹ افرامی تھی۔

’خاکم بدین‘ کی اشاعت کے ۶ سال بعد ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو ’تزک یوسفی‘ کے نام سے مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تیسری کتاب ’زرد گزشت‘ کا مقدمہ قلم بند کیا۔ یہ یکم اپریل ۱۹۷۶ء کو مکتبہ ادبیات کراچی سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی اور اب تک اس کی نو اشائیں عمل میں آچکی ہیں۔ ’زرد گزشت‘ مشتاق احمد یوسفی کی Banking Life کے روز و شب کی داستان ہے، جو پچیس برسوں پر محیط ہے۔ اسے انہوں نے اپنی سوانح نو عمری کہا ہے۔ ’زرد گزشت‘ ۱۹۷۰ء (جب انہوں نے جنوری ۱۹۷۰ء کی پہلی صبح کو سرزمین پاکستان پر قدم رکھا) سے لے کر ۱۹۷۵ء کے دورائے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے یہ ابواب ’سختی‘ پر تھا پہلا کتاب دیا کا، اور ہے دیکھتے اور دیکھتے، عیب دہن، کیا کوئی وحشی اور اپنی کیا کوئی قیدی چھوٹ گیا، غم و یاد، پوٹو کول، قینی ڈارنگ، کوئی قلم کوئی دیا کوئی قلمرو مدے، جانا ہمارا

کاک ٹیل پارٹی میں، تاکہ، موصوف اور موصوفہ کے عنوانات سے مزین ہیں۔ اس کتاب کا مقصد شخص خود کو اجاگر کرنا ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے مثبت و منفی رویوں پر بھی روشنی ڈالنا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اسے بھی ’آدم بی ادبی ایوارڈ‘ سے نوازا گیا۔ ’زرد گزشت‘ کا انتخاب ’مکتبہ صفیہ‘ اور ’سرت علی صدیقی‘ کے نام ہے جو ان کے دوست ہیں (۱۹۷۹ء)

۱۹۷۹ء میں مشتاق احمد یوسفی لندن، برطانیہ (England) چلے گئے۔ ’زرد گزشت‘ کے ۱۳ برس بعد ’غلام غلام‘ کے زیر عنوان ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اپنی چوتھی کتاب ’آب گم‘ کا مقدمہ تحریر کیا اس کی پہلی اشاعت فروری ۱۹۹۰ء میں مکتبہ ادبیات کراچی سے ہوئی۔

’آب گم‘ پر صغیر پاک و ہند کی تقسیم کے پس منظر میں ہجرت کر کے آنے والوں پر ہجرت کے بعد کے حالات اور تقسیم ہند کے (خوشنوار و ناخوار) نتائج پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے Land Landscape اور سیاسی و سماجی اور مرقی نوئی اقدار کے حوالوں کی ایک ایسی دستاویز ہے جو اپنی بہت کے لحاظ سے مکتبہ کا کچھ جانے کے لائق ہے، تاہم جدید ناول نگاری کے بھی قریب تر ہے اور نثر عالیہ کے حوالے سے دنیا کے ادب میں بھی رکتے جانے کے لائق ہے۔ یہ سراسر ہماری ذاتی رائے ہے اور یہ قلم حاضر ووری نہیں کہ اس سے اتفاق نہ کیا جائے۔

’آب گم کا انتخاب‘ اپنے بچوں ارشد، نریش زرخار اور سہما کے نام ہے۔ مکتبہ ادبیات کراچی اس سے یہ کتاب چار بار شائع ہو چکی ہے۔ ’آب گم‘ کے پانچ ابواب حویلی، اسکول، ماسٹر کا خواب، کار کاٹی والا والدین، یہ چراغ، شہر و قصہ اور میری گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ شامل کتاب ہیں۔ اس کتاب پر انہیں ’نجر ایوارڈ‘ (نجر و ایوارڈ) دیا گیا۔

’آب گم‘ کے مقدمے سے یہ پتا ہے کہ ’زرد گزشت‘ کا دوسرا حصہ بھی لکھا گیا تھا جسے شائع بھی ہوا تھا نیز ’آب گم‘ کے علاوہ پانچ مزید اس نوعیت کے طویل مضامین تھے جو لندن ہی میں رقم ہوئے تھے لیکن مشتاق احمد یوسفی کے مطابق یہ دونوں کتابیں اب خواب ہو گئیں اب ایک اور پانچویں کتاب جو مکمل ہوئی ہے، مدقوس سے اپنی اشاعت کا راستہ دیکھتی ہے جس کے متعلق انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ کتاب میں قسام ابواب ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتے ہیں۔

’میں چاہتا ہوں کہ پانچویں کتاب آئے تو وہ خود ہی مختلف ہو جائے اس کے

کسی کو میں Continue کروں تو اس میں میری کچھ غم ہو گئی ہے ایسا ہے میں

کہیں مزاح یا خفگی سے کہے جیسے اہل عرب میں۔ لیکن جو فی صاحب کا یہ بیان اہل عرب سے ہے کہ "تورگزشٹ"
 میں کوئی نقد یا تنقید نہیں کی گئی، یہ حوالہ "معنیات" ص ۳۶ (مقالہ نگار)
 (۳۷) اس وقت صرف مسلم کرشل بینک کے ساتھ "The" لکھا تھا۔
 (۳۸) مشتاق احمد جو فی سے محول بالا اطروحہ کے ذریعے سے مقالہ نگاری حاصل کردہ معلومات۔
 (۳۹) عثمان غالب ہے کہ اس نقل مکانی کے بعد جس منظر میں جنرل میاں احمدی کے دور آمریت کا چھوٹا کچھ عمل دخل
 ضرور ہے۔ وضاحت کے لئے "آپ گم" کا مقدمہ "غور و فکر" نمبر ۱۰ دیکھ فرمائیے۔
 (۴۰) انگریزی میں "تورگزشٹ" اردو میں "تیسرا ایڈیشن" ۱۹۸۳ء میں ۹۲۸
 (۴۱) چوں کہ مشتاق احمد جو فی کے تنہا کا تعلق "یارو" سے تھا اس لئے یہ امکان بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ یارو میں
 غلطی کے حاملان سے ان کی پہچان سے کوئی قرابت واری ہو یا پھر تنہا کی وجہ سے کوئی رشتہ قائم ہوا ہو۔ یہ بھی
 ممکن ہے کہ جن بدوں ان کے دادا ملک خان آگرہ میں مذکور رہتے رہے ہوں ان کا کوئی تعلق دستور احمد
 خان کے خاندان سے پیدا ہوا ہو اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب الحاقی محض ہو اور یارو میں غلطی سے ان کا اپنا تعلق مسلم
 یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم کے دوران میں استوار ہوا ہو۔ بہر حال ان سب امکانات سے کوئی ایسا نتیجہ برآمد
 کرتے ہو یا صرف انہیں روشنی بخیل دے گا کہ ایک مستند قویہ ہے کہ شاید کوئی جدیداتی (تجاسی) تحقیق درست ثابت
 ہو اور دوسرا مستند یہ کہ "تورگزشٹ" کا یہ نام نہایت پرانا ہے۔
 (۴۲) مشتاق احمد جو فی سے محول بالا اطروحہ کے ذریعے سے مقالہ نگاری حاصل کردہ معلومات۔
 (۴۳) "تورگزشٹ" کا باب "کوئی حق پرست، کوئی اور کوئی ناقص" اسے "معلوم نام" دیکھ ہو۔
 Member of Royal College of Physicians (۴۴)
 (۴۵) تفصیل جاننے کے لئے مقالہ نگاری کتاب "معنیات" کے صفحات ۳۳ تا ۳۶ دیکھیں۔
 (۴۶) مشتاق احمد جو فی کی کتابوں کی تفصیل جاننے کے لئے "معنیات" کے صفحہ نمبر ۳۶ کا مطالعہ کیجئے۔
 (۴۷) مشتاق احمد جو فی سے محول بالا اطروحہ کے ذریعے سے مقالہ نگاری حاصل کردہ معلومات۔
 (۴۸) بحوالہ "آج کل گفت و روز" ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳

(۵۳) مشتاق احمد بریلوی، "آج کل کی گفت و شنود"، لاہور، المیزان پبلشرز، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۳۳۔

(۵۴) مشتاق احمد بریلوی، "پہلوئے مصداق"، تاریخ، اراچی میں ۱۹۹۵ء، بہارِ مقام کراچی۔

(۵۶) اسرار کے ضمن میں مزید تفصیل جاننے کے لیے مقالہ نگارش کتاب "سوفیست" سے لیجئے۔

(۵۷) حوالہ نمبر ۱۰، آپ کا ٹریکنگ ایجنسی، پیو بریلوی آف سرگودھا، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۔

(۵۸) مشتاق احمد بریلوی، "پہلوئے مصداق"، تاریخ، اراچی میں ۱۹۹۵ء، بہارِ مقام کراچی۔

(۵۹) یہ امر سمجھنے میں ایک پہلو بھی ہے کہ عظیم تر خطرات کو پہلے ہی نمایاں ہے۔ (مقالہ نگار)۔

(۶۰) مشتاق احمد بریلوی، "پہلوئے مصداق"، تاریخ، اراچی میں ۱۹۹۵ء، بہارِ مقام کراچی۔

(۶۱) غالباً انہی صورتوں کا "آپ گم" میں ذکر جازمی کی بحث کے دوران میں ذکر کیا گیا ہے۔

(۶۲) دیکھیں کسی اکابر بات ہے کہ مشتاق احمد بریلوی نے کونسل سے دل اور خان کا نام اور ذکر کرنا چھوٹا ہو گیا اور نہ آپ خود اپنے کردار اور خان کی فی نفسہ کیا پیمانہ ہے اور دل اور خان کی بات بچوڑ ہے خود بخود ہی مثال آپ سب کے سامنے ہے۔ (مقالہ نگار)

(۶۳) دوسری دورانی پیشتر مکتبہ انبیاء واقع صدر کراچی سے اراچی میں ۱۹۹۵ء کی ایک ملاقات۔

(۶۴) کرنل محمد خان مرحوم کا مصنف کے نام سے اپنی اصل ۱۹۹۵ء کو لکھا گیا تھا۔

(۶۵) مسرت علی صاحبی صاحب کا خطابہ جامعہ مدرسہ اشرفیہ، مقالہ بحوالہ بالا ذکر کرنا یہ دو تین ملتان میں ۱۹۸۵ء۔

(۶۶) سید عمیر حفصی، مشغول، "مشتاق احمد بریلوی کی چراغ کشی سے آپ گم تک"، دانشما، اول سال ۱۹۹۸ء۔

(۶۷) شان الحق حسینی، مشغول، ایضاً بحوالہ بالا ص ۹۰۔

(۶۸) مشتاق احمد بریلوی، "آپ گم" کراچی، مکتبہ انبیاء، دانشما سے اول تقریب، ۱۹۹۰ء، ص ۵۳۔

(۶۹) دیکھئے "روزگزشتہ"، ص ۳۳۔

(۷۰) مشتاق احمد بریلوی، "سنگولہ نظروں کے ذریعے سے مقالہ نگاری کا عمل کر رہے معلومات۔"

(۷۱) مشتاق احمد بریلوی، "پہلوئے مصداق"، تاریخ، اراچی میں ۱۹۹۵ء، بہارِ مقام کراچی۔

(۷۲) سپریم منسٹرون بلاتنامہ "سویرا" کے ۲۳ ویں شمارے میں شائع ہوا، "نیا پانی نیا گلزار" وغیرہ۔

"کرکٹ" سویرا کے ۲۹ ویں شمارے میں شائع ہوا، "کاغذی ہے بی بی کن" کے ۳۰ ویں شمارے میں شائع ہوا۔

(۷۳) پہلوئے مصداق، "تضرعت" علامہ ابو نعیم زبیر، مدظلہ العالی، خلیفہ دارالعلوم، عبد القدوس رشک، جلد: ۹، شمارہ: ۹، جون ۱۹۵۹ء۔

(۷۴) اس وقت ماہنامہ "افکار" کراچی سے صحابہ لکھنؤی مرحوم کی ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا، اس کے ۹۲، ۹۳ ویں شماروں اور ۹۴ شمارے میں یہ مضامین شائع ہوئے۔

(۷۵) "بولی دنیا"، ادبی میراج، جلد: ۱، شمارہ: ۱، جولائی ۱۹۸۲ء۔

(۷۶) "فلوئڈ"، سالانہ ۱۹۸۰ء، شمارہ: ۱، جلد: ۱، شمارہ: ۱، جولائی ۱۹۸۰ء۔

(۷۷) روزنامہ "جنگ" کراچی کے ادبی ایلوشن کی اشاعتیں ۱۵ جولائی ۱۹۸۲ء، ۲۳ جولائی ۱۹۸۲ء، ۲۹ جولائی ۱۹۸۲ء۔

مارکسٹ ۱۲ مارکسٹ اور ۱۹ مارکسٹ ۱۹۸۴ء کی تاریخوں میں ہوئی۔

(۷۸) صاحبزادہ یوسفی مرحوم ایڈیٹر ”الکاف“ نے بتایا کہ ”میراج“ سے ”نام انہوں نے جو بدنام کیا تھا لیکن کوئی شہادت نہیں مل سکی، خبر مشتاق احمد یوسفی صاحب نے بھی تائید نہیں فرمائی۔ (مقالہ نگار)

(۷۹) مسرت علی صاحبہ یوسفی شاعر ہیں اور مسرت علی سرور کے نام سے ان کا شعری مجموعہ ”نوائے ہے تو“ کہتے ہیں (کراچی) کے قحط چھپ چکا ہے اس میں مشتاق احمد یوسفی پر بھی عمدہ نظمیں موجود ہیں، یہ معلومات نہیں ان کی ایک نظم ”نظم یوسفی“ صاحب کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے شامل کی گئی ہے۔ میاں فضل حسن مرحوم سوچتے، ان کا بیانیہ تعلق چھوٹے سے تھا، سکونت الہ آباد کراچی میں تھی، ادب ان کی پہچان نہیں اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں، کیوں کہ ان کا محمد امان اور مشتاق احمد یوسفی بھی شخصیت کو تڑکڑاتے کا اعزاز ہی ان کو دینے تک ضرور دیکھنے کے لئے کافی ہے۔ (مقالہ نگار)

(۸۰) مشتاق احمد یوسفی، ”یہ حوالہ“ ۱۹۷۲ء، پیرائے ۱۱ مارچ ۱۹۹۵ء، مسلمان کراچی

(۸۱) اس بات کی وضاحت کے لیے اگر آخر کتاب میں سید حمید جعفری کا مضمون ملاحظہ ہو۔

(۸۲) مشتاق احمد یوسفی سے تعلق بالائندہ کے ذریعے سے مقالہ نگاری حاصل کرو، معلومات۔

(۸۳) ۲۳ مارچ ۲۰۰۲ء کو پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد سٹریٹ پر تقریب نشر کی گئی، جس میں فوجی افسران اور فوجی شخصیات کو مختلف اعزاز اور اعزازات سے نوازا گیا۔ یہ اعزازات اس وقت کے صدر پاکستان (چیف آف دی آرمی سٹاف) پرویز مشرف نے تقسیم کیے۔ (مقالہ نگار)

اقوال یوسفی

ظفر و مزاج

* وارڈ ۱۱ اوچھا پڑے، یا بس ایک روایتی آج کی سرور

جائے تو لوگ اسے باعلوم ظفر سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ مزاج

ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا

(پیش ہے)

* سادہ و پرکار ظفر ہے بڑی جان جو کھوں کا کام۔ بڑے

بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے ظفر نگار سننے ہوئے رہتے

پر اتر اتر کر کر تب نہیں دکھاتے بلکہ

رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواریں پر

(چراغ ہے)

* عمل مزاج اپنے لبو کی آگ میں تپ کر نکلنے کا نام

ہے۔ کڑی جل کر کونہ بن جاتی ہے اور کونہ راکھ۔ لیکن اگر کونے

کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا، ہیرا

بن جاتا ہے۔ (پیش ہے)

* چنے کی آزادی فی نظریہ تقریر کی آزادی سے کہیں زیادہ

مقدم و مقدس ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ پر جی کھول

* طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود
ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ (ناکم بہن)

* مزاج نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ فنی فنی میں اس طرح
کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بھی بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔ میں
نے کبھی کسی ہلکے کارمولوی یا مزاج نگار کو محض تقریر و تحریر کی پاداش
میں جیل جاتے نہیں دیکھا۔ (درگزشت)

* مزاج کی مہیسی مار بھی شوخ آنکھ پر کار عورت اور دلیر
کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی۔ (درگزشت)

* قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں چٹنی
اور اچار لاکھ لاکھ رے دار تہی، لیکن ان سے بھوکے کا بیت نہیں
بھرا جاسکتا۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں،
ریگستان کے شہزادہ کم ہو جاتے ہیں۔ (درگزشت)

* ماورائے قسطنطنیہ اور مزاج جو سچائی اور دانائی سے
عامی سے۔ دریدہ فنی، ہلکے پن اور فحصول سے زیادہ مشیت
نہیں رکھتا، زمین اور زبان کی دنیا یک رخوں، یک
چشموں کی دنیا ہے۔ محو حسی کی سنگڑوں آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ ان
سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے۔ گفتگو نگار بھی اپنے پورے وجود
سے سب کچھ دیکھتا، سنتا، سہتا اور سہارتا چلا جاتا ہے اور قضا میں

کرنس سکتی ہے وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتی۔ (چراغئے)

* اختصار نظر افست اور زائد لباس کی جان ہے۔ (چراغئے)

* مزاج نگار کے لیے نصیحت، فضیلت اور فہمائش حرام
ہیں۔ وہ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قد آدم دیا اور قبیلہ
کھڑی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا روئے خداں سورج کبھی پھول کی
مانند، ہمیشہ سرخسہ نور کی جانب رکھتا ہے اور جب اس کا سورج
ڈوب جاتا ہے تو اپنا رخ اس سمت کر لیتا ہے، جدھر سے وہ پھر
طلوع ہوگا۔ (ناکم بہن)

* جس مزاجی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہوتو
انسان ہر مقام سے بے آسانی گزر جاتا ہے۔
بے نشہ کس کو طاقت آشوب آگئی
(ناکم بہن)

* مزاج، مذہب اور انکھل ہر چیز میں بآسانی حل ہو جاتے
ہیں۔ (ناکم بہن)

* مزاج نگار اس وقت تک تبسم زیر لب کا سزاوار
نہیں، جب تک اس نے دنیا اور اہل دنیا سے رنج کے پیار نہ کیا
ہو۔ (ناکم بہن)

اپنے سارے رنگ بکھیر کے کسی نئے افق کی تلاش میں
گم ہو جاتا ہے۔ (زرغرشت)

* قدیم زمانے میں چین میں یہ دستور تھا کہ جس شخص
کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا، اس کی تاک پر سفیدی پوت دیتے
تھے۔ پھر وہ دیکھا کرتی بھی گیسریات کہتا، کلاؤن ہی گنتا تھا۔ کم و بیش
یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ (آب گم)

* قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ (آب گم)

* مزاح کو جس وقایع کے لئے نظم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار
نہیں، اس شخص کا زور بہتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے
جین لیتا ہے۔ (آب گم)

ادب

* شبلی نے عمر شبلی کے خلاف جہاد کر کے ثابت کر دیا کہ
عشق عطیہ قدرت ہے۔ (پرواز ۱۷)

* وہ (اختر شیرانی) وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا
پچھٹائی مانگ رہا ہے۔ (غلام بدین)

* اس خالم (ہوش خلق آبادی) کے قحط خانے وصل کے یہ تیم ہیں
گو یا کوئی پشمان ڈانٹ ڈانٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر رہا ہے۔
(غلام بدین)

* فانی مصور غم ہیں تو مہدی مصور بہت غم۔ (غلام بدین)

* ان (مولانا ابوالکلام آزاد) کی لڑکھانہ مٹا لیا ہے جیسے
دلہل میں تیرتا۔ (غلام بدین)

* مولانا (ابوالکلام آزاد) کا شرب بھی ان کے شرب
کی مانند تھا، پونے ہوئے ہوں کو جوڑ جوڑ کر امام الہند نے ایسا
معبود تراشنے کی کوشش کی جو اہل سومات کو بھی قابل قبول
ہو۔ (غلام بدین)

* آغا حشر کے مکالمے قلم عربی میں بھی نثر اور زور بکتر
پہننے، رہنے کو اور میرا تے داخل ہوتے ہیں جبکہ میدان جنگ میں ان
کا ہر قدم فکار سے پر پڑتا ہے۔ (آبِ گم)

* ہمارے خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونڈنے کی اجازت
صرف دو صورتوں میں ملنی چاہیے، اول اس موقع پر جب دونوں
میں سے ایک وفات پا چکا ہو۔ دوسرے اس صورت میں جب
دونوں میں سے ایک اردو تھا تو جس پر مرے احوال فرض ہی
نہیں ذریعہ معاش اور وجہ شہرت بھی ہو۔ (آبِ گم)

* کلام داغ آسمان فصاحت سے اُترا، کوٹھنے پہ انکار،
وہاں سے بچسا تو کوٹھنے پہ آئے دیکھا۔ (آبِ گم)

* شعر کتنا ہی لطو اور کمزور کیوں نہ ہو، اسے نظم خود کا نثر اور
حذف کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنی اولاد کو بد صورت کہنا یا زنجیر
سے لٹا دینا اور اسے خود اٹھا کر نہ۔ (آبِ گم)

* حقیقت نگاری کے پردے میں مثنوی دارِ طوائف کو اردو
فلش ٹکینے والوں سے ملی اتنی اپنے شہینہ گاہکوں سے بھی نہ ملی
ہوگی۔ (آبِ گم)

* رہے ایوانِ کام آزاد سو واپسی اتنا کے قنیل تھے۔ اسلام
میں اگر انسان کو تہذیب روا ہونا تو وہ اپنے آپ کو تہذیب کرتے۔
(زر زشت)

* بچھو کہ کا رونا اور سانپ کا کاٹ سوتا ہے۔ انسانی کا کالا
سوتے میں مسکراتا ہے۔ (زر زشت)

* مولانا ایوانِ کام آزاد تو شرک آرائی فریم صرف پسندیدہ
فارسی اشعار نا قینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے
اشعار بے محل نہیں ہوتے، ماحول تہذیبی محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنی شہرت کا
تمام تر رشتہ کو کون (گویا) اپنے گاڑھے گاڑھے لعابِ ذہن سے
فارسی شعر کے گرد لپکتے ہیں۔ (آبِ گم)

* کلام غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شہرتیں ہیں،
وہ نہ ہوں تو غالب کا سمجھنا پندار مشکل نہیں۔ (آبِ گم)

* دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو کچھ میں نہ آئے تو دھن
مزا دیتا ہے۔ (آبِ گم)

* آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر میٹ کے ٹینس
کھیلنا۔ (آبِ گم)

عورت

* سبز بہ سبز تازہ تازہ اور گراہے کرنسی توٹوں کا عطر نکال
گرملازمت پیشہ حضرات اور ان کی بیویوں کو مینے کی آخری
تاریخوں کو سنگھایا جائے تو گرجستی زندگی جنت کا نمونہ بن
جائے۔ (چراغ تے)

* بیوی کو بھروسہ کر لے جانا ایسا حق ہے جیسے کوئی
ایوہرست سر کرنے لگے اور تھرماس میں گھر سے برف کی ڈلی رکھ کر
لے جائے۔ (تاکم بدین)

* مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں
لگتا ہے۔ (تاکم بدین)

* پہاڑ اور اونچا عورت دراصل آگن پینٹنگ کی طرح
ہوتے ہیں۔ انھیں ارفاقہ سے دیکھنا چاہیے۔ (تاکم بدین)

* ۳۵ تک پچھتے پچھتے عورت مصری SPHINX
(ایوالبول) ہو جاتی ہے۔ چہرہ عورت کا اور دھڑ و غیرہ شیر جہر کا۔
(زرگزشت)

* ننگ دستی نہ ہو تو تندرست آدمی کی تمنا کا دوسرا قدم
گرجستی حدود کے باہر چلتا ہے۔ (زرگزشت)

* عورت کی ایچی بناؤ تو اس کے پیچھے سے کسی نہ کسی مرد کی
ناک ضرور نکلے گی۔ (زرگزشت)

* گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور
بات سے کیا جاتا ہے۔ (چراغ تے)

* دراصل گرجستی زندگی کی آپ دیوا ہی ایسی معتدل ہے
کہ مولسری کا پھول دو تین سال میں گوبھی کا پھول بن جائے تو
عجب نہیں۔ (چراغ تے)

* زلیخا حضرت یوسف کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے وہ بارہ
جوان ہوئی۔ (چراغ تے)

* قلوپٹرو کے نازک اندام ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ نہار
مصری تریوز کا پانی اور رعیت کا خون پیتی تھی۔ (چراغ تے)

* ملکہ متا زحل اور تاج محل کی خوبصورتی کا راز ایک ہی ہے
۔۔۔ سفید رنگ۔ (چراغ تے)

نا سٹلجیا

* اپنے ماضی سے شینگی رکھنے والوں کی مثال ایک ایسی مخلوق کی سی ہے جس کی آنکھیں گدی کے پیچھے لگی ہوتی ہیں۔
(چراغ نے)

* اپنا تو عقیدہ ہے کہ جسے ماضی یاد نہیں رہتا اس کی زندگی میں شاید کبھی کچھ ہوا ہی نہیں، لیکن جو اپنے ماضی کو یاد ہی نہیں کرتا چاہتا وہ یقیناً لو فر رہا ہوگا۔ (چراغ نے)

* جینا ہے تو بھٹکتے، سرسراتے لئے کو دانتوں سے پکڑو، گزرتے لئے کو بے چسپاں چھاتی سے لگاؤ کہ اس کی نس نس میں ماضی کا نیم گرم خون دوڑ رہا ہے۔ اسی کی جیتی جیتی کوکھ سے مستقبل جنم لے گا اور اپنی جھیل میں دکھا کر آخرا سی کی طرف لوٹے گا۔
(چراغ نے)

* جو قوم یعنی پسماندہ، در ماندہ اور پست خوصلہ ہو، اس کو اپنا ماضی، معکوس تقلیدی تناسب (Inverse geometrical ratio) میں، اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دیرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ (آب ہم)

* مرد کی پسند وہ پلا صراط ہے جس پر کوئی موئی عورت نہیں چل سکتی۔ (چراغ نے)

* یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جولہ کی دور سے ستر برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دور سے ستر برس کی دکھائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر ستر برس کی نکلتی ہے۔
(نامک دین)

* گانے والی کی صورت اچھی ہو تو مہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ (نامک دین)

جانور

* انسان کئے کا بہترین رفیق ہے۔ (جانا ہے)

* مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں اور وہ کسی ایسے جانور کو صحبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھانا نہیں۔
(جانا ہے)

* آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مرغ کی آواز، اس کی جسمات کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ (جانا ہے)

* جس گھر رکنا ہو، اس گھر میں پورا ہی نہیں، رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ (ناکام دین)

* چروہ جانور جسے مسلمان کھا سکتے ہیں، پاک ہے۔
(ناکام دین)

* جو شخص ستنے سے بھی نہ ڈرے، مجھے اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ (ناکام دین)

* چیری میں پرانی ضرب انشل کے مطابق صدعیب ہوں یا

نہ ہوں، ایک صیب ضرور ہے جو سو بیہوں پر بھاری ہے اور وہ ہے ناطلیجا۔ (آپ گم)

* چیری میں ماضی اپنی تمام مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ (آپ گم)

* بوڑھے آدمی کے حال کی سب سے بڑی خرابی اس کا ماضی ہوتا ہے، جو بھلائے نہیں بھولتا۔ (آپ گم)

* آقا کے سامنے بے اختیار بننے والی کتنے کی دم بچھلے جزم
میں کسی مصاحب کی زبان تھی۔ کتنا اس کام کے لیے اپنی زبان
استعمال نہیں کرتا۔ (آپ گم)

* عمر طبعی تک تو صرف کوئے، پکھوئے، گدوئے، گدوئے اور
وہ جانور جیتے ہیں جن کا کھانا شرعاً حرام ہے۔ (آپ گم)

* گھوڑے کی ٹانگوں کا استعمال صرف دو صورتوں میں
جائز ہے۔ اول میدان جنگ میں دشمن پر تیز رفتاری سے حمل
کرنے کے لیے دوم حملہ نام کام ہو تو میدان جنگ سے دگنی تیز
رفتاری سے بھاگنے کے لیے۔ (آپ گم)

* کتنے میں سے اگر جہز نکال دیا جائے تو خاصا معقول
جانور ہے۔ (خاکم بہن)

* ہندو میں ہمیں اس کے علاوہ اور کوئی عیب نظر نہیں آتا کہ
وہ انسان کا جدا علی ہے۔ (زرگزشٹ)
* بھوکنا کتنے کا حق اور دم بلانا اس کا فرض ہے۔
(زرگزشٹ)

* پالتو جانور کی چپ دھڑا اور اس کا پیار کتنا بھرپور ہوتا
ہے۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی دکھی ہو یا تنہا۔
(زرگزشٹ)

* شیر کو بچرے میں قید کر دو، جب بھی شیر ہی رہتا ہے۔ گیدڑ
کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا۔ (آپ گم)
* کھانے پر کتنے ہی صدے گزر جائیں، کتنا ہی بوڑھا ہو
جائے، اس کے پر و بال کالے ہی رہتے ہیں۔ (آپ گم)

* جانوروں میں کتا اور گھوڑا انسان کے سب سے پہلے اور
پکے رفیق ہیں۔ جنہوں نے اس کی خاطر ہمیشہ کے لیے جنگل
چھوڑا۔ (آپ گم)

کراچی

* اہل کراچی اس واللہ اعلم بالصواب قسم کے موسم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ دو تین گھنٹے تبدیل نہ ہو تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ (پرانے)

* بدلتے ہوئے موسم کے اس عجیبان کار و باری شہر میں مچلی اور مہمان پہلے ہی دن بدیدہ بنے لگتے ہیں۔ (پرانے)

* اگر کوئی چھوٹوں بھی اڑا دے کہ لاہور میں اولے پڑے ہیں تو زندہ دلاں کراچی فوراً سرمنڈا لیتے ہیں۔ (پرانے)

* سچ تو یہ ہے کہ کراچی میں طبیعت کے سوا کوئی چیز ہری نہیں ہوتی۔ (پرانے)

* ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے، جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔ (آب نم)

* کراچی کی ہوا میں اتنی رطوبت اور دلوں میں اتنی رقت ہے کہ کھلے میں ہاتھ پھیلا کر اور آنکھیں موند کر کھڑے ہو جاؤ تو پانچ منٹ میں چلو بھر پانی اور ہتھیلی بھر پیسے جمع ہو جائیں گے اور

اگر چھ منٹ تک ہاتھ پھیلائے اور آنکھیں موندے رہو تو پیسے غائب ہو جائیں گے۔ (آب نم)

* یہاں (کراچی) ہال، سائی لنسر اور لیجن قفل از وقت چمڑ جاتے ہیں۔ (آب نم)

* کراچی کی پانچ چیزوں کا کم از کم اس دنیا میں تو جواب نہیں، چڑاؤ زیورات، قوالی، بریانی، گالی اور غود کا عطر۔ (آب نم)

* کراچی میں ادھار پر بزنس یو پار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کماؤ (گنے) کے کھیت میں کبڈی کھیلنا! بنتا بڑا شہر ہوگا اتنا ہی بڑا گھپا اور پھندا ہوگا۔ جس کی چھت زیادہ بڑی ہے اس پر برف بھی زیادہ گرے گی۔ (آب نم)

متفرقات

آنکھ کا نشہ

* سب سے بڑا نشہ آنکھ کا نشہ ہوتا ہے اور سب سے عمدہ گناہ آنکھ کا گناہ ہے۔ (آپ گم)

Solo Performance

* ہمارے ہاں نائچ گانا، سکرانی اور مٹھ مرہ اکل کھرے قس ہیں۔ ان کا سارا مزہ اور بنیاد ہی Solo Performance پر ہے۔ اسی لیے سیاست میں نعرے اور جلوس اور مشاعرے میں داو اور ہونگ ہماری ضرورت، روایت اور سچائی والو بن گئے۔ (آپ گم)

طب اور طوائف

* طب اور طوائف ہمارے ہاں بد قسمتی سے لازم و ملزوم ہیں۔ (آپ گم)

ذکرِ گناہ

* ذکرِ گناہ، عملِ گناہ سے کہیں زیادہ لذیذ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ خوبیل ہو اور راوی جسمانی اور معنوی دونوں لحاظ سے ضعیف ہو۔ (آپ گم)

گفتگو کی بنیاد

* ہماری گتلی کی بنیاد طبلے پر ہے۔ گفتگو کی بنیاد گالی پر۔ (آپ گم)

شہادت جاریہ

* کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آزمائش، تقویتِ مطہرہ اور شہادتِ عظمیٰ ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ ربِ جلیل انھیں شہادت جاریہ کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔ (آپ گم)

اجنبی

* گاؤں میں اجنبی کی آمد کا اعلان نکلے، مور اور بچے کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سارے گاؤں اور ہر گھر کا مہمان بن جاتا ہے۔ (آپ گم)

نجات

* کبھی اپنے کسی بزرگ یا باپ یا اپنے سے کم بد معاش آدمی کی اصلاح کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ انھیں غلط راہ پر دیکھو تو تین دانا بندر ورا کی طرح اندھے، بہرے اور گوستے بن جاؤ۔ نجات کرو گے۔ (آپ گم)

دروغ مصلحت آمیز

* تمام عمر دروغ مصلحت آمیز کے ساتھ فنی خوشی گزارہ کرنے کے بعد قبر میں پہنچ کر اور کفن پھاڑ کر سچ بولنے اور منہ چاڑھنے کی کوشش کرنا مردوں ہی کو نہیں مردوں کو بھی زیب نہیں دیتا۔ (آپ تم)

لمحے کی سچائی

* ہر لمحے کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے۔ اس سچائی کا اعانہ والہ جگ بھی صرف اسی اور صرف اسی لمحے وادب ہوتا ہے۔ سو جو چپ رہا اس نے اس لمحے سے اور اپنے آپ سے کہیں دغا کی۔ (آپ تم)

آسمان

* جس آسمان پر کبوتر، شفق، چٹنگ اور ستارے نہ ہوں ایسے آسمان کی طرف نظر اٹھائے دیکھئے کوئی نہیں چاہتا۔ (آپ تم)

شوق کی پہچان

* سچے شوق اور ہابی کی پہچان یہ ہے کہ بالکل مضمحل اور بے مصرف ہو۔ (آپ تم)

ٹوٹی لاشی

* ہزار لاشی ٹوٹی ہو، پھر بھی گھر بھر کے برتن باسن توڑنے کو بہت ہے۔ (آپ تم)

بے کئی بیوی

* بڑھاپے میں نئی روشنی کی بے کئی بیوی سے نہا کرنا اسے قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ (آپ تم)

بے حس اور نکلنا

* جب آدمی اپنے کام پر فخر کرنا چھوڑ دے تو وہ بہت جلد بے حس اور نکلا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے کام کو بھی جگ چُجُ ذلیل اور گھٹیا بنا دیتا ہے۔ (آپ تم)

مرد کا ناپید ہونا

* محبت اچھی ہوتی ہے۔ پتا نہ چورٹ کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں، بس مرد کا ناپید ہونا کافی ہووے ہے۔ (آپ تم)

نخالص قسم

* بے سبب دشمنی اور بد صورت عورت سے عشق حقیقت میں
دشمنی اور عشق کی سب سے نخالص قسم ہے۔ کس واسطے کہ یہ شروع
ہی وہاں سے ہو ویں ہیں جہاں عقل ختم ہو جاوے ہے۔ (آپ تم)

آسانی دلیل

* مسلمان لڑکے سب میں قبل ہونے کو اپنے مسلمان
ہونے کی آسانی دلیل سمجھتے ہیں۔ (آپ تم)

گنتی کے سانس

* بعض سادھوؤں اور جوگیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان
کے مقدر میں بھگوان نے گنتی کے سانس رکھے ہیں۔ چنانچہ بیشتر
وقت سانس روکے بیٹھے رہتے ہیں تاکہ زندگی بقدر جس دم لمبی ہو
جائے۔ طوعاً و کرہاً گنڈے دار سانس فقرا اس لیے لے لیتے ہیں
کہ اسے روک سکیں۔ (آپ تم)

اچھا استاد

* اچھے استاد کے اندر ایک بچہ بیٹھا ہوتا ہے جو ہاتھ اٹھا
کر اور سر ہٹا کر بتاتا ہوتا ہے کہ بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔
(آپ تم)

پروفیسر

* اپنے ہاں جو لڑکے پڑھائی میں محسّسّی ہوتے ہیں وہ
فوج میں چلے جاتے ہیں اور جو فوج کے لیے Medically
unfit ہوتے ہیں وہ کالجوں میں پروفیسر بن جاتے ہیں۔
(آپ تم)

نظر کا مول

* مشرق کی ہزاروں سال پرانی ریت ہے کہ پانی، صحت
اور تعلیم کا پیہہ نہیں لیا جاتا، پیہہ لے کر تو یہ انگلی نہیں نکلتے اور انجام
کار پیہہ بھی نہیں بچتا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ معاہدہ دے کر
حاصل کیے ہوئے علم سے کوئی روحانی تبدیلی آئی ہو۔ نئی تبدیلی
صرف کسی کی نظر سے آتی ہے اور نظر کا کوئی مول نہیں۔ (آپ تم)

گدھے کی سواری

* سواری سے نفس مونا ہوتا ہے، سوارے گدھے کی سواری
کے، اسی لیے بنی اسرائیل کے پیغمبروں نے گدھے کی سواری کی
ہے۔ (آپ تم)

وقت

* صاحب! فاصلے کو گز سے نہیں، وقت سے ناپنا چاہیے۔
(آپ تم)

نرو مادہ

* پرندوں، چمکیوں، مچھلیوں، Punks اور اردو الفاظ میں نرو مادہ کی تیز کرنا انسان کے بس کا کام نہیں۔ (آپ گم)

ہم عمر بڑھے

* اپنے ہم عمر بڑھوں سے محض ہاتھ ملانے سے آدمی کی زندگی ہر مصائب کے بعد ایک سال گھٹ جاتی ہے۔ (آپ گم)

کلا کا سہاگ

* ہر پہاڑ کو کوئی نہ کوئی تیشہ بردار فراہم مل جاتا ہے۔ کلا کا سہاگ بھی کبھی اُجڑا ہے۔ اس کی مانگ تو سدا سیندور اور ستاروں سے بھری رہے گی۔ (آپ گم)

نمرتا

* ہندو رشتہ لینے میں بھی ایسی نمرتا (انکسار) ایسا اخلاق اور اعتدال برتنا ہے کہ دھندو پارہ دیتے کوئی چاہتا ہے۔ (آپ گم)

افورڈ

* صاحب آپ راہی، زانی اور شرابی کو ہمیشہ خوش اخلاق، شہسار اور پیٹھا پائیں گے۔ اس واسطے کہ وہ نخوت، سخت گیری اور بد مزاجی افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔ (آپ گم)

مادری زبان

* کالی، گنتی، سرگوشی اور گندہ لطیفہ تو اپنی مادری زبان میں ہی حرو و بنا ہے۔ (آپ گم)

مڈل کلاس فریبی

* مڈل کلاس فریبی کی سب سے قابل رحم اور نا علاج قسم وہ ہے جس میں آدمی کے پاس کچھ نہ ہو لیکن اسے کسی چیز کی محسوس نہ ہو۔ (آپ گم)

نر آدمی کی لکار

* پشتو مقتدر و زاری اور فریاد و فغاں کی زبان نہیں، نر آدمی کی لکار ہے۔ (آپ گم)

ہارا ہوا امرغا

* ہارا ہوا امرغا کھانے سے آدمی اتھا ہوا ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ہر بات درست معلوم ہونے لگتی ہے۔ (آپ گم)

چیتا سے

* اصل رونا جھرافہ کا نہیں جوانی اور بیتے سے کا ہے جو آپ حیاتِ امروز میں زہر گھول دیتا ہے۔ (آپ گم)

بارہ سنگھا

* بارہ سنگھا ماں کے پیٹ سے سینگوں کے جھاڑ سمیت پیدا نہیں ہوتا۔ (آبِ گم)

سچا

* اتر اتر اتر کے کھینے والے کو نکھارا اور کھل کھینے والی کو کھلاڑ کہتے ہیں بالکل اسی طرح بات بے بات کج بولنے والے کو سندھی میں "سچا" کہتے ہیں۔ (آبِ گم)

ایزی میں آنکھیں

* جوان لڑکی کی ایزی میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ چلتی ہے تو اتے پتہ ہوتا ہے کہ چپکے کون کسی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ (آبِ گم)

دشمنی اور انتقام

* دشمنی اور انتقام کے بغیر مروت کی زندگی بے مقصد لا حاصل اور مکمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ (آبِ گم)

جنگل کی خوشبو

* جس آدمی کو جنگل کی خوشبو آتی اور بھاتی رہے وہ کبھی کسی کی تلامی اور جھگڑی قبول نہیں کرے گا۔ (آبِ گم)

لفظوں کی جنگ

* لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہوشیہ صرف سچائی ہوتی ہے۔ (آبِ گم)

دل پر رقم

* خود زندگی جو کچھ دکھاتی، سکھاتی اور پڑھاتی ہے وہ سیدھا دل پر رقم ہوتا ہے۔ (آبِ گم)

جھنجھلاہٹ

* خواری کا اصل سبب سمجھ میں آجائے تو جھنجھلاہٹ جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کو چپ لگ جاتی ہے۔ (آبِ گم)

اوپھی پونھی، منخوس سواری

* اوپھی پونھی یہ پارسی کو اور منخوس سواری مالک کو کھلا جاتی ہے۔ (آبِ گم)

خطائے نسواں

* انسان خطائے نسواں کا پتلا ہے۔ (آبِ گم)

بجر نجرانہ

* کبھی اکلم فیکس آفیسر، پولیس، جوان جو رہ اور بھر فقیر کے پاس جاؤ تو سو بھر کی مالک کھائی ہاتھ ہلاتے، ڈال مار ج کرتے تھیں جاؤ، میٹش کوئی ڈالی، کچھ مال پانی، کچھ بجر نجرانہ لے کے جاؤ۔ (آپ گم)

ریورس کنیر

* شیر، ہوائی جہاز، گولی، ترک اور پٹھان ریورس کنیر میں چل ہی نہیں سکتے۔ (آپ گم)

غرض مند

* غرض مند صرف آئینے کا منہ چوسا سکتا ہے۔ (آپ گم)

جوان جو رو

* آنکھوں گوڈوں میں پانی اتر آئے تو مہمون اور چپی ماش کار گر نہیں ہوتی۔ پھر تو لاٹھی بیساکھی چاہیے یا جوان جو رو۔ (آپ گم)

باون گز کا مینار

* ہم نے باون گز گہرے ایسے اندھے کوئیں بھی دیکھے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ خود کو اووند عماریں یعنی سر کے بل اٹکے کھڑے ہو جائیں تو باون گز کا مینار بن جائیں گے۔ (آپ گم)

ڈاکٹروں کا حصہ

* پرائیوٹ اسپتال اور کلینک میں مرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مرنوم کی جائداد، جمع ہتھ اور بینک پلیٹس کے ہزارے پر ہسپتال کمان میں خون خرابا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سب ڈاکٹروں کے حصے میں آجاتے ہیں۔ (آپ گم)

دغل

* ایک عمر ایسی آتی ہے جب انسان دوسروں کے کاموں میں دغل دینے ہی کو اپنا عمل شمار کرنے لگتا ہے۔ (آپ گم)

بج

* فی زمانہ ۱۰۰ فی صد بج بول کر زندگی کرنا ایسا ہی ہے جیسے بجزی ملانے بغیر، صرف سینٹ سے مکان بنانا۔ (آپ گم)

ذلیل و خوار

* سچ بول کر ذلیل و خوار ہونے کی یہ نسبت جھوٹ بول کر
ذلیل و خوار ہونا بہتر ہے۔ آدمی کو کم از کم صبر تو آ جاتا ہے کہ کس
بات کی سزا مل رہی ہے۔ (آپ کم)

شاہوں کا نالہ

* شاہوں کا نالہ پابند لے سی نہیں، پابند نے بھی نہیں
ہوتا۔ (آپ کم)

لقیمہ

* بھائی میرے! بخشا کوئی نہیں، ہم سب ایک دوسرے کا
ازوقہ ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں
تب نظر آتی ہے اک حمد تری صورت
(آپ کم)

دلہن اور جانور

* شریف گھرانوں میں آئی ہوئی دلہن اور جانور تو مر کر ہی
ٹپکتے ہیں۔ (آپ کم)

بے توقیر

* سبکی، بے وقری اور ذلت کی سب سے ذلیل صورت یہ
ہے کہ آدمی خود اپنی نظر میں بے وقعت و بے توقیر ہو جائے۔
(آپ کم)

عقل میں فتور

* جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ
شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور ہے۔ (آپ کم)

ڈی مور یا ناز

* جب فیور اور با اصول آدمی حتی القدر دھکے کھائے کے
بعد "ڈی مور یا ناز" ہو کر کامیاب لوگوں کے جھگڑے اپنانے کی
بھڑکی کوشش کرتا ہے تو یہی سبکی بات اور بگڑ جاتی ہے۔ (آپ کم)

گھوڑا

* جو شخص گھوڑے پر نہیں بیٹھتا، وہ کبھی سیر چشم، فیور اور شیر
دلیر نہیں ہو سکتا۔ (آپ کم)

پیسے

* جس دن بچے کی جیب سے فضول چیزوں کے بجائے،
پیسے برآمد ہوں تو سمجھ لیتا چاہیے کہ اب اسے بے فکری کی نیند کبھی
نہیں ہوگی۔ (آپ کم)

دل پسند سواری

* بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مستقل اور دل پسند سواری درحقیقت رعایا ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ اس پر سواری کا تجربہ لیں تو پھر انھیں سامنے کوئی کنواں، کھائی، پاڑھ اور رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ جوش شذوری و شہ سواری میں نوشہہ دیوار وانی دیوار بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ (آبِ گم)

دُم

* سب سے اعلیٰ و افضل وہ دُم قرار پائے گی جو جھڑیچلی ہے۔ اس لیے کہ اس حادثے کے بعد ہی اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الما ررض کا درجہ ملتا ہے۔ (آبِ گم)

دل میں زہر

* انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔ (آبِ گم)

جان کی امان

* بعض اوقات غریب کو مونچھ سرف اس لیے رکھنی پڑتی ہے کہ بوقت ضرورت بچنی کر کے جان کی امان پائے۔ (آبِ گم)

خوابِ نیم روز اور فینٹسی

* خوابِ نیم روز (Day dreaming) اور فینٹسی سے دو ہی صورتوں میں چمکے رائل سکتا ہے۔ اول جب وہ فینٹسی نہ رہے، حقیقت بن جائے۔ دوم، انسان کسی چوراہے بلکہ شش و پنج رہے پر اپنے سوتے جاگتے ہزارے سارے خواب بخشوا کر رخصت چاہے۔ (آبِ گم)

اداسی

* غصہ جتنا کم ہوگا، اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی۔ (آبِ گم)

دوڑتا ہوا درخت

* میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ (آبِ گم)

منافعِ بریا کار

* الحمد للہ! میں منافع، بریا کار نہیں میں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔ (آبِ گم)

لفظوں کے بندر

* ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا، کبھی عیا و عمامہ، کبھی ڈز بیٹ یا فوٹس کیپ، کبھی پیر میں پائل یا جڑی پٹے نظر آتے ہیں اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈمگہ کی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے سدھائے بندر تاپنے لگتے ہیں۔ (آپ ہم)

پردہ

* کبوتر مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے خواہ مردہ ہی کیوں نہ ہو۔ (آپ ہم)

جڑیں

* جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی ہے اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے۔ جو منی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ (آپ ہم)

ہاتھ پھیرو

* یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی تلیا، پالی مریا اور چٹنی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے۔ (آپ ہم)

وہی فرنیچر

* پورچین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے، جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچہ، یار اور پہلوئے ولد ارکوٹیشن کیا جاسکتا ہے۔ (آپ ہم)

تابالغوں کے شغل

* بیٹھا پان، بھری اور ناول، یہ سب تابالغوں کے شغل ہیں۔ (آپ ہم)

راجستھان کے تین تھنے

* راجستھان کے تین طرفہ تھنوں کے تو ہم بھی قائل اور قائل ہیں۔ میرا پائی، مہدی حسن اور راجستھان۔ (آپ ہم)

دل اور جوانی

* داغ تو دو ہی چیزوں پر بنتا ہے۔ دل اور جوانی۔ (آپ ہم)

ذہنی سکون اور بے فکری

* زندگی اور کیرئیر میں دو چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔
اول عزت دوم ذہنی سکون اور بے فکری۔ (آپ تم)

زندگی کا راز

* ہر دکھ، ہر غم، ہر اندام کے بعد زندگی، آدمی پر اپنا ایک راز
کھول دیتا ہے۔ (آپ تم)

دکھ

* ہر شخص کے ذہن میں پیش و فراغت کا ایک نقشہ ہوتا ہے
جو دراصل چہ ہوتا ہے، اس غماز بات کا جو دوسروں کے حصے
میں آیا ہے۔ لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے۔
(آپ تم)

یادوں کے فانوس

* یوڑھا اور تنہا آدمی ایک ایسے کھنڈر میں رہتا ہے جہاں
بحری دو پہر میں چہ اٹاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھا کے
سونے کا وقت آتا ہے تو یادوں کے فانوس جگمگ جگمگ روشن
ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (آپ تم)

رومانی ہالہ

* ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ بکھینچ دیتا ہے۔ گزرا
ہوا اور ابھی سہانا لگتا ہے۔ (آپ تم)

مست ملنگ

* آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو
جاتا ہے یا کسی ٹینس لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔ (آپ تم)

آدمی

* آدمی اتنا ہی تنہا ہوتا ہے جتنا محسوس کرتا ہے۔
(آپ تم)

آنکھیں

* مرض کا نام معلوم ہو جائے تو تکلیف تو دور نہیں ہوتی،
آنکھیں دور ہو جاتی ہیں۔ (آپ تم)

ڈھلک

* جب کوئی شخص دوسروں کو قائل کرنے کے لیے زور شور
سے فلسفہ اور منطق بگھارنے لگے تو سمجھ جائیے کہ اندر سے وہ ہمارا
خود ڈھلک رہا ہے۔ (آپ تم)

* اچھا معلم ہونے کے لیے عالم ہونے کی شرط نہیں ہے۔
(آپ تم)

* دلوں کے قفل کی کلید لفظ میں نہیں ہے بلکہ ہوتی ہے۔
(آپ تم)

ما یوس ہونے کا فائدہ

* قبل از وقت ما یوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ
ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ذر پہلے ہی نکل جاتا ہے۔ (آپ تم)

بوڑھا

* جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ بے کشش نظر آنے
لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بوڑھا
ہو گیا ہے۔ (آپ تم)

Rarity

* بد صورت انگریز عورت Rarity (نایاب) ہے۔ بڑی
مشکل سے نظر آتی ہے۔ (آپ تم)

بن مانگے مشورے

* انسان کا کوئی کام بگڑ جائے تو ناکامی سے اتنی کوفت نہیں
ہوتی جتنی ان بن مانگے مشوروں اور نصیحتوں سے ہوتی ہے جن
سے ہر وہ شخص نوازا جاتا ہے جس نے کبھی اس کام کو ہاتھ تک نہیں
لگایا۔ (آپ تم)

ذکر گناہ

* ذکر گناہ، عمل گناہ سے کہیں زیادہ لذت دیتا ہے۔
(آپ تم)

سب سے نمایاں

* جہاں کبھی تاج پہنے بیٹھے ہوں، وہاں نگے سر، خاک ہسر
آدی سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ (آپ تم)

چار گھنٹے

* حقانے، حواالات یا قیل میں آدی چار گھنٹے بھی گزار لے تو
زندگی اور حضرت انسان کے بارے میں اتنا کچھ سیکھ لے گا کہ
یونیورسٹی میں چالیس برس رہ کر بھی نہیں سیکھ سکتا۔ (آپ تم)

تہمت

* ایک عمر ایسی بھی آتی ہے کہ آدمی کو تہمت سے بھی یک
گونہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ (زرگشت)

نری بد معاشی

* مرد عشق و عاشقی صرف ایک ہی مرتبہ کرتا ہے، دوسری
مرتبہ عیاشی اور اس کے بعد نری بد معاشی۔ (زرگشت)

پان

* آدمی کو کھانا اپنی پیوی کے ہاتھ کا پینا ہے اور پان پرائی
کے ہاتھ کا پینا ہے۔ (زرگشت)

مخاورے

* مخاورے زبان کے بڑھے ہوئے ناخن ہوتے ہیں۔
(زرگشت)

نشر اور سوانح حیات

* نشر اور سوانح حیات میں جو نہ کھلے، اس سے ڈرنا
چاہیے۔ (زرگشت)

پب اور پار

* شائستگی، مرداداری اور پردہ بازی میں انگریزوں کا جواب
نہیں۔ مذہب، سیاست اور نیکی پر کسی اور کیس بھی محفل میں گفتگو کرنا
خلاف تہذیب اور انتہائی معیوب سمجھتے ہیں۔ سوائے پب (شراب
خانہ) اور پار کے۔ (آپ گم)

پاکستان

* پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ کچھ
انکلی ہیں۔ (آپ گم)

اچڑا گھر

* جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا مہنگھر بجاتے، اس گھر کے
سامنے ایک نہ ایک دن دوائے اور قرقی کا ڈھول بجاتا آزی ہے۔ وہ گھر
اچڑے ہی اچڑے۔ (آپ گم)

چاڑا

* چاڑے اور بڑھاپے کو بھتا محسوس کرو گے اتنا ہی گلتا چلا
جائے گا۔ (زرگشت)

بچپن کے کھلونے

* بچپن کے کھلونے نوٹے نوٹے ہی نوٹے ہیں۔
(زرگشت)

دھیرج

* زمین میں ذرا سا سوراخ کرنا ہو تو پوری طاقت سے
کدال چلائی پڑتی ہے۔ لیکن خاک، برنج، کول اکھوے اور نرم
وتا رک پھیری کس دھیرج سے اسی زمین کو ایک اواسے رضامند
کر کے نکل آتے ہیں۔ (زرگشت)

روپ بہروپ

* جس نے ایک بار گوشت پاشت کا روپ بہروپ دیکھ لیا
اس کی تسکین پھر کبھی پر چھائیوں سے نہیں ہوگی۔ (زرگشت)

چیل، کیل، وکیل

* آسمان کی فیل، چوگٹ کی کیل اور گورٹ کے وکیل سے
خدا بچائے، بچا کر کے چھوڑتے ہیں۔ (زرگشت)

خوش دلی

* خوش دلی کی ایک منزل بے حسی سے پہلے پڑتی ہے اور
ایک اس کے بعد۔ (زرگشت)

شرابی

* خالی پوری اور شرابی کو کون کھڑا رکھ سکتا ہے۔
(زرگشت)

کتاب

* کتاب خوب صورت پیڑی کی طرح ہوتی ہے۔ دور سے
کھڑے کھڑے دیکھ کر داد دینے کے لیے، بغل میں دبا کر لے
جانے کے لیے نہیں۔ (زرگشت)

سور کے چڑے کی ڈائری

* سور، شراب، اپنے افسروں کی تاریخ پیدائش اور جوے
کی بار بیت کا صاب رکھنے کے لیے سور کے چڑے کی ڈائری
سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ (زرگشت)

آم

* آم اگر پہلے ترش نہ ہو تو پھر کبھی میٹھا نہیں ہو سکتا۔
(زرگشت)

موچھ اور سگار

* موچھ اور سگار کے بغیر پیار کیسا ادھورا ادھورا، پھیکا، شیر خوار لگتا ہے۔ (زرگشت)

ایجاد

* تاش کے جتنے بھی کھیل ہیں وہ مردوں نے ایک دوسرے کو چپ رکھنے کے لیے ایجاد کئے ہیں۔ (زرگشت)

آسمانی کشش

* ۱۹۵۲ء کے بعد سے زمین کی کشش ہر چیز کو نیچے کھینچتی ہے، سوائے قیمتوں، پاکستانی بیورو کریٹ کے سہ اور ماڈرن Bra کے مشمولات کے جو فی زمانہ صرف آسمانی کشش کے تابع ہیں۔ (زرگشت)

بواس

* گھونے، چنگی، چھڑی، گنڈاسے اور بندوق کی چوٹ ایک بھی نہیں ہوتی۔ ہر ملک کے بھول، ہر دیس کی تاری کی بواس جد ہوتی ہے۔ (زرگشت)

کم حرام

* شراب کو ڈرگس کہا جائے تو کم حرام معلوم ہوتی ہے۔ (زرگشت)

طرز تعزیر

* الزاموں کی نوعیت بدلتی رہی ہے، مگر زمانے کا طرز تعزیر آج بھی وہی ہے۔ (زرگشت)

جوتا

* جوتا ایسی چیز نہیں کہ زیور کی طرح مانجھا جائے کر پہن لیا جائے۔ (زرگشت)

دھرتی

* دھرتی اپنا آپا اور بھید بھاد جوتے کے تلے کو نہیں دکھایا کرتی۔ (زرگشت)

گاف

* امریکن تینوں گاف یعنی گنٹلو، گانا، اور گالی ناک سے ادا و عطا کرتے ہیں۔ (زرگشت)

ایئر کریش

* بحری جہاز کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا ایئر کریش نہیں ہوتا۔
(زرگشت)

مذاق

* ہمارے یہاں مذاق کانے کا اڑایا جاتا ہے، اندھے کو
اندھا اور نائی کو نائی نہیں کہتے، حافظ جی اور ظیفہ کہتے ہیں۔
(زرگشت)

انگلینڈ

* پاکستانی پرنس مین، یورو کریٹ اور منکر کی ڈکٹری میں
”انگلینڈ“ سے زیادہ سڑی گالی کوئی نہیں۔ (زرگشت)

آنکھیں

* فقیر کے لیے آنکھیں نہ ہونا بڑی نعمت ہے۔
(زرگشت)

آوارگی

* موہک بھلی اور آوارگی میں خرابی یہ ہے کہ آدمی ایک دفعہ شروع
کر دے تو سمجھ میں نہیں آتا ختم کیسے کرے۔ (زرگشت)

گرمی

* گرمی کھائی ہوئی روٹی اور لڑکی کا کون لیواں ہوتا ہے۔
(زرگشت)

لچھن

* ایچا اور اولاد کے لچھن پہلے ہی سے معلوم ہو چاہا کرتے
تو دنیا میں نہ کوئی بچہ ہونے دیتا اور نہ ایچا۔ (زرگشت)

قبر کھودنے والا

* قبر کھودنے والا ہر میت پر آنسو بہانے بیٹھ جائے تو
روتے روتے اندھا ہو جائے۔ (زرگشت)

جب ذرا گردن نکالی دیکھی

* یہ میکنیم قدرت نے صرف کچھوے ہی میں رکھا ہے کہ
ذرا کوئی چیز ناگوار خاطر ہوئی اور سٹ سے گردن اندر کر
لی۔ بصورت دیگر جب ذرا گردن نکالی دیکھی۔ (زرگشت)

موٹی کھال

* لمبی عمر کا راز دراصل نیند، موٹی کھال اور Slow
living میں مضمر ہے۔ (زرگشت)

تذکیر و تانیث

* تلیر اور اردو الفاظ کی تذکیر و تانیث معلوم کرنے کے لیے چھٹی حس درکار ہے۔ (زرگزشت)

چالیس کا بیٹا

* چالیس کے بیٹے میں آنے کے بعد وال، کھائی، ہم عمروں کی صحبت اور آئینے سے پرہیز لازم ہے۔ (زرگزشت)

بے پور

* آپ تو بے پور کی مشہور چیزیں صرف سائڈ، کھاڑ، بھانڈ اور رائی بتاتے ہیں۔ (زرگزشت)

رشتے دار

* دشمنوں کے، حسب عداوت، تین درجے ہیں دشمن، جانی دشمن اور رشتے دار۔ (زرگزشت)

یک زوجیہ

* دوسرے کا ذبح کیا ہوا گوشت کھانے سے آدمی بزدلا، یک زوجیہ اور چپ زبان ہو جاتا ہے۔ (زرگزشت)

شیطان کی ورک شاپ

* خالی دماغ شیطان کی ورک شاپ ہوتا ہے۔ (زرگزشت)

رس

* بھینے، مرغی کی ٹانگ، پیار اور گتے پر جب تک دانٹ نہ لگے رس پیدا نہیں ہوتا۔ (زرگزشت)

بڑھاپے کی شادی

* بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ذرا فرق نہیں۔ سوتے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنی پڑتی ہے اور چھپا پھاتھ رکھ کے سوتا پڑتا ہے۔ (زرگزشت)

قصاب

* قصاب کہیں گوسفندوں کی کثرت سے گھبراتا ہے۔ (زرگزشت)

انساں کا پتلا

* انسان فٹا وٹساں کا پتلا ہے۔ (زرگزشت)

کامیابی کا راز

* کامیابی کے لیے صحت، محنت، دیانت اور ڈھانت از بس ضروری ہیں۔ (زرگشت)

روپ کی راجدھانی

* بھلے گھرانوں میں وہ ایک جو روپ کی راجدھانی ہیں۔ کپڑے کی صنعت کے مہون منت نہیں ہوتے۔ (زرگشت)

کثرت و زیادتی

* نرمی بات اور نرمی عادت کا صحیح لطف و لذت دراصل کثرت و زیادتی (Excess) میں ہی آتا ہے۔ صاحبِ اعتدال پر اتنا ہی اصرار ہے تو نیکی کرو۔ کون روکتا ہے۔ (زرگشت)

سدا سہاگن راگنیاں

* یوں بھی بھیر دیں اور خوشامد سدا سہاگن راگنیاں ہیں۔ ہر وقت، ہر محفل اور موسم میں مزادیتی ہیں۔ (زرگشت)

وقف

* جوانی دیوانی کا وقف بیوی سے مارا جاتا ہے۔ بیوی کا وقف اولاد سے مارتے ہیں اور اولاد کا سائنسی تعلیم سے، سائنسی تعلیم کا وقف اپنے ہاں دینیات سے مارا جاتا ہے۔ ارے صاحب وقف کا مرنا کھیل نہیں ہے مرتے مرتے مرنا ہے۔ (زرگشت)

غیبت

* دنیا میں غیبت سے زیادہ دوزخ و جہنم کوئی چیز نہیں۔ (زرگشت)

بجلی

* بجلی ایک ہی جگہ دو بار نہیں گرا کرتی۔ (زرگشت)

جھاڑ اور بڑھاپا

* جھاڑ سے اور بڑھاپے کو جتنا تازیا، وہ محسوس کروا تا کہ اسی گدا چلا جاتا ہے۔ (زرگشت)

سرتاپا سپردگی

* دولت، سیاست، عمرت اور عبادت، مکمل یکسوئی، مکمل خود گزاشتگی، سرتاپا سپردگی چاہتی ہیں۔ ذرا دھیان بہنک اور منزل کھوئی ہوئی۔ (زرگشت)

سود اور سلطان

* سود اور سلطان کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔
(زرگشت)

آدمی جاگ اٹھے

* صبح اس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلے ہے، صبح اس وقت ہوتی ہے، جب آدمی جاگ اٹھے۔ (زرگشت)

اترا اتر کر چلنا

* قومیں جب اللہ کی زمین پر اترا اتر کر چلے نکلتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر مند سے شق ہو جاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں۔ (زرگشت)

اجازت کے بغیر

* دنیا میں جہاں کہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہماری اجازت کے بغیر ہو رہا ہے۔ (زرگشت)

عام آدمی

* عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقع ایسے آتے ہیں جب وہ تنہا سب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے۔ عقیقہ، نکاح اور تدفین۔ (زرگشت)

عام آدمی

* عام آدمی تو بے چارہ اتنی بھی سکت اور استقامت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزادی کے تین مسئلہ اور میں تقسیم کر سکے یعنی جوانی میں فضیلت، وصالی عمر میں فصاحت اور بڑھاپے میں وحشیت۔ (زرگشت)

حشو و زوائد

* اپنی تہذیب میں کائنات پہچانت کرنے اور حشو و زوائد کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی عمل ہے جیسے سرجن اپنا اپنڈکس آپ نکالنے کی کوشش کرے۔ (زرگشت)

تجارت اور تجارت

* تجارت اور تجارت میں نیگو ممکن نہیں۔ (ناکم بدین)

درد و اذیت کا احساس

* ہمارے ہاں عورت اور شراب کو اب تک گورو و فارم کی نگاہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی درد و اذیت کا احساس منانے کے لیے، نہ کہ درد و اذیت کی خاطر۔ (ناکم بدین)

نری عاشقی

* آدمی بوالہوسی میں کمزوری یا کاہلی دکھائے تو نری عاشقی
رو جاتی ہے۔ (نام بدین)

عمر و سبطی

* باکی فوکل، السر، بد نظری، کاف، بنی نسل سے پیاری،
رتیقہ الطلی اور آسودہ حالی۔ یہ عمر و سبطی کی جانی پہچانی نشانیان
ہیں۔ (نام بدین)

عمر

* خون، مبتک، عشق اور نا جائز دولت کی طرح عمر بھی
چھپائے نہیں چھتی۔ (نام بدین)

کایا کا سکھ

* کایا کا سکھ چاہو تو جوانی میں میرے بن جاؤ اور بڑھاپے
میں اعدائے۔ (نام بدین)

جوتے

* مسجد میں ہم کبھی عام جوتے پہن کر نہیں جاتے۔ اس لیے
کہ جوتے اگر ثابت ہوں تو مسجد سے میں دل انھیں میں پزار پتا
ہے۔ (نام بدین)

تھوڑا سا آرام

* محل اسج کا بجز میری کوئی علاقہ نہیں۔ ہاں ننگ دہلی اور
تصوف سے تھوڑا سا آرام آ جاتا ہے۔ (نام بدین)

داد

* ایک رقصہ اپنے حسن و کمال کی داد لینے دوسری رقصہ
کے پاس نہیں جاتی۔ داد تو تماشائیوں سے ملتی ہے۔ (نام بدین)

ظہیر سے کا کبوتر

* ظہیر سے کا کبوتر تالیوں سے نہیں اڑتا۔ (نام بدین)

بہر مند

* بہر مند کے ہاتھ میں اوزار بھی ہتھیار بن جاتا ہے۔
(نام بدین)

ایک عمر کا ریاض

* ایک مقیم خود سپردگی، ایک بے تاب آمادگی کے ساتھ مرنے کے لیے ایک عمر کا ریاض درکار ہے۔ یہ بڑے عرف اور حوصلے کا کام ہے۔ (ناکم بدین)

ولدیت

* جس طرح آج کل کسی کی عمر یا تنخواہ دریافت کرنا بڑی بات سمجھی جاتی ہے اسی طرح، بالکل اسی طرح میں سال بعد کسی کی ولدیت پوچھنا بد اخلاقی سمجھی جائے گی۔ (ناکم بدین)

مانگی

* کنارے کو ترسا ہوا مانگی ہر اُٹھلی کھاڑی میں نظر ڈال دیتا ہے۔ (ناکم بدین)

زبان

* صاحب! خدا نے ایک پارہ گوشت کو جانے کس لذت سے ہنکار کر دیا۔ اگر سارا بدن اس لذت سے آشنا ہو جاتا تو انسان اس کی تاب نہ لاتا۔ زمین کی چھاتی چھت جاتی۔ (ناکم بدین)

باہر کی پیاز

* ہر شب آنکھ میں اترنے والے من و سلوٹی کے مقابلے باہر کی پیاز کی گنغھی مزادے جاتی ہے۔ (ناکم بدین)

حماقت

* مرزا حماقت بھی کرتے ہیں تو اس قدر اور بیکس کہ یہ خدا الہامی معلوم ہوتی ہے۔ (ناکم بدین)

آلو اور مذہب

* جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا، اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔ (ناکم بدین)

شادی و طلاق

* صاحب مرد کا کیا ہے آج کل مرد زندگی سے اُکٹتا جاتا ہے تو شادی کر لیتا ہے اور اگر شادی شدہ ہے تو طلاق دے دیتا ہے۔ (ناکم بدین)

انگریز عورت

* کوئی انگریز عورت جسے اپنا فکر اور مستقبل ذرا بھی عزیز ہے، آلو کو چھوتی تک نہیں۔ (ناکم بدین)

* ہوا اگر قرہی رشتہ داروں کے ساتھ کھیا جائے تو کم گناہ ہوتا ہے۔ (نام بدین)

علم الحساب اور مسلمان

* علم الحساب درحقیقت کسی متعصب کافر نے مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ (نام بدین)

مصیبت

* انسان واحد جو ان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس ہو جاتا ہے۔ (نام بدین)

صاحب معاملہ

* خود و بنا چہ لکھنے میں وہی سہولت اور قاعدے مضمر ہیں جو خود کشی میں ہوتے ہیں، یعنی تاریخ وقات، آلودگی اور موقع واردات کا انتخاب صاحب معاملہ خود کرتا ہے۔ (نام بدین)

پروفیسر

* آدمی ایک بار پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی رہتا ہے، خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کر لے لگے۔ (نام بدین)

تخمی آم

* انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیادہ کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہوں۔ (نام بدین)

فی

* اگر کوئی شخص تجارت میں بہت جلد نہ کام نہ ہو سکے تو سمجھ لو کہ اس کے حسب نسب میں فی ہے۔ (نام بدین)

جینے کا فلسفہ

* بیسویں صدی میں جیت ان ہی کی ہے جن کے ایک ہاتھ میں زمین ہے اور دوسرے میں دنیا اور دائیں ہاتھ کو خیر نہیں کہ بائیں میں کیا ہے۔ (نام بدین)

بُری صحبت

* تفریق میں بُری صحبت سے پرہیز لازم ہے۔
(چراغِ گئے)

قنولی

* قنولی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ (چراغِ گئے)

ہیکڑ

* قومیں پٹ پٹ کرنی ہیکڑ ہوتی ہیں۔ (چراغِ گئے)

تعزیری مشقت

* ہمارے ہاں کرکٹ مشغلہ ہے نہ مشن، اچھی خاصی تعزیری مشقت ہے، جس میں کام سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔
(چراغِ گئے)

تماشائی کی تالی

* یاد رکھو! تماشے میں جان تماشائی کی تالی سے پڑتی ہے، نہ کہ مداری کی ڈگدگی سے۔ (چراغِ گئے)

تاش

* آپ تجارت اور عبادت تو کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں، لیکن تاش صرف اشرافوں کے ساتھ کھیلنے چاہئیں۔ (چراغِ گئے)

بخت

* بخت واحد ایسا جگہ ہے جس کا حال اور مستقبل اس کے ماضی سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ (چراغِ گئے)

وانت اور پنپے

* قدرت کے کھیل نرا لے ہوتے ہیں۔ جب وہ وانت دیتی ہے تو پنپے نہیں ہوتے اور جب پنپے دیتے پر آتی ہے تو وانت نمارد۔ (چراغِ گئے)

گلہ

* موسم، معشوق اور حکومت کا گلہ ہمیشہ سے ہمارا قومی مشغلہ رہا ہے۔ (چراغِ گئے)

تضاد

* ان (انگریز) کی قومی خصلت ہے کہ وہ تفریح کے معاملے میں انتہائی جذباتی ہو جاتے ہیں اور معاملات و محبت میں پر لے درجے کے کاروباری اسی خوش گو اور تضاد کا نتیجہ ہے کہ ان کا فلسفہ حد درجہ سلیبی ہے اور مزاج نہایت گہرا۔ (چراغ تھے)

بد معاشی

* فی زمانہ ہم تو شاعری کو جب تک کہ وہ کسی کا ذریعہ معاش نہ ہو، نری عیاشی بلکہ بد معاشی سمجھتے ہیں۔ (چراغ تھے)

ایک جیسی شکل

* سچ تو یہ ہے کہ مجھے سب مرغ و نوزائیدہ بچے اور کچھ ایک جیسی شکل کے نظر آتے ہیں۔ (چراغ تھے)

مرغ و مولا

* مرغ و مولا کے رزق کی فکر تو اللہ میاں کو بھی نہیں ہوتی۔ (چراغ تھے)

چار پائی اور غریب رشتے دار

* اونچے گھرانوں میں اب ایسی چار پائیوں کو غریب رشتہ داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لیے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ (چراغ تھے)

روٹی، دوٹی اور منٹو کے افسانے

* مثل مشہور ہے کہ سردی روٹی سے جاتی ہے یا دوٹی سے لیکن اگر یہ اسباب تائید ہوں اور سردی زیادہ اور لحاف پتلا ہو تو غریب غریبا منٹو کے افسانے پڑھ کر سو رہے ہیں۔ (چراغ تھے)

گول میز

* بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ (چراغ تھے)

فرصت کے لمحات

* کسی شخص کی شان و شرافت کا اندازہ آپ صرف اس سے لگا سکتے ہیں کہ وہ فرصت کے لمحات میں کیا کرتا ہے اور رات کو کسی قسم کے خواب دیکھتا ہے۔ (چراغ تھے)

اعلیٰ تہذیب

* ممکن ہے مد و نذا اعلیٰ تہذیب کو جنم نہ دے سکے، لیکن اعلیٰ تہذیب کبھی خراب نذا برداشت نہیں کر سکتی۔ (چراغ ہے)

زندگی کی رفتار

* وقت کو انسان ہنسی یا رقتیم کرے گا، زندگی کی رفتار اتنی ہی تیز اور تینچا موت اتنی ہی قریب ہوتی جاتی ہے۔ (چراغ ہے)

پیری و موت کا ذائقہ

* جس شخص نے بھی ناقابل تقسیم رواں دواں وقت کو پہلی بار سیکنڈ، سال اور صدی میں تقسیم کیا، اس نے انسان کو صحیح معنوں میں پیری اور موت کا ذائقہ چکھایا۔ (چراغ ہے)

عمر

* عمر بھی خمیر اور جوتے کی مانند ہے، جن کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دیے لگیں۔ (چراغ ہے)

ذہنی چھاؤں

* چڑھتی دو پہر سے ذہنی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ (چراغ ہے)

وہ پے پاؤں

* زبردست جدیلیاں ہمیشہ وہ پے پاؤں آتی ہیں۔ (چراغ ہے)

بڑے آدمیوں کا اعمال نامہ

* تاریخ بڑے آدمیوں کا اعمال نامہ ہے جو لفظی سے ہمارے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ (چراغ ہے)

ہیے کا مقصد

* آدمی اگر قبل از وقت مر نہ سکے تو ہیے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ (چراغ ہے)

لذت

* کسی اچھے بھلے کام کو عیب سمجھ کر کیا جائے تو اس میں لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ (چراغ ہے)

وانا

* وانا وہی ہے جو ذرا محنت کر کے اپنی ذات میں کوئی ایسا نمایاں عیب پیدا کر لے جو اس کے اصل بیبوں کو ڈھانپ لے۔
(چراغ ہے)

رشتہ دار

* بڑھیا سگریٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کر دیتے کوئی چاہتا ہے۔ خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔ (چراغ ہے)

واہ، آہ، کراہ

* حسن اور جوانی سے بہرہ یاب ہونے کا سلیقہ بھی کچھ کچھ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب واہ ایک گہری آہ اور آہ ایک لمبی کراہ میں بدل چکی ہوتی ہے۔ (چراغ ہے)

امریکہ کی ترقی

* امریکہ کی ترقی کا سبب یہی ہے کہ اس کا کوئی ماضی نہیں۔
(چراغ ہے)

ملنگ کا دل

* ملنگ کے دل میں سبیل پر قبضہ کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ (چراغ ہے)

جوان مولوی اور بوڑھا شاعر

* جوان مولوی اور بوڑھے شاعر پر اپنا دل تو نہیں ٹھکتا۔
(چراغ ہے)

اطمینان

* سچ تو یہ ہے کہ نکلومتوں کے علاوہ کوئی بھی اپنی موجودہ ترقی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ (چراغ ہے)

ترقی کی نشانی

* اپنے عہد سے غیر مطمئن ہونا بجائے خود ترقی کی نشانی ہے۔ (چراغ ہے)

کہاوٹ

* کافی کا چلا جائے پھونک پھونک کر چیتا ہے۔ (چراغ ہے)

تلفظ کی مجبوری

* میں ماکولات میں مقولات کا . دخل جائز نہیں سمجھتا
تاؤنیک اس کھیلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔ (پرغ ہے)

سلیقہ

* اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے
کے لیے سلیقہ چاہیے۔ (پرغ ہے)

عمر و غذا

* عمر و غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے
اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کے ہر راہ گیر کو سینے سے لگا
لوں۔ (پرغ ہے)

صحیح غذا اور غلط مشورہ

* میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو
پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔ اسی سے ذہنی توازن
 قائم رہتا ہے۔ (پرغ ہے)

حزان پر سی

* مار فیا کے انکشن مریض کے بجائے حزان پر سی کرنے
والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔
(پرغ ہے)

موت اور شادی

* انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت
معلوم ہوتی ہے۔ (پرغ ہے)

پہلا پتھر

* جس شخص کو پہلا پتھر پھینکنے وقت اپنا سر یا وہیں رہتا داسے
دوسروں پر پتھر پھینکنے کا حق نہیں۔ (پرغ ہے)

افسانہ نگاری کے نام سے پکاریں گے۔ قرۃ العین حیدر اور ہاجرہ مسرور کو اگر خاتون افسانہ نگار کہا جائے تو وہ بجا طور پر برا قرار دیے گئے، جب کہ ہمیں پانچویں ایلیا کو کوئی خاتون انگریز شاعر کہہ دے تو کم از کم اہم تو بہت خوش ہوں گے۔

اس وقت میرے سامان گمان میں نہ تھا کہ تین برسوں بعد ہی ایسا ہوگا۔ پڑے گا کہ ایک مزاح نگار کو ایک خاتون افسانہ نگار پر مضمون پڑھنا پڑے گا۔ اگلے دنوں میں دو ٹکے، تھوڑے سے ایک برتن میں جمع ہونے کو قرآن الفیہ میں کہتے تھے، لیکن دو سو دہائیوں کو ایک دوسرے کی قسمت کا حال داتے دیکھنا سنا۔ جو کچھ فلک دکھائے سونا چاند دیکھنا، آج کی روئے مفضل مختار، بشری رٹن ایک کثیر القصاصی اور جامع الخیالات ادیب ہیں۔ ناول نگار افسانہ نویس سیاست دان سابق ممبر پنجاب اسمبلی ممتاز سماجی کارکن، افعال فنی آرٹ (Feminist) شعلہ بیابا خطیبہ، دانشور، کالم نگار، ایڈیٹر، جیولیر، ایک سلسلہ عالیہ سے بچت، بے شمار عمرے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو خرچ کر چکی ہیں۔ جو بارہ اوصاف ہم نے ابھی گنوائے، ان میں سے ایک بھی ہماری ذات ہے۔ صفات میں نہیں پایا جاتا۔ گمان غالب ہے کہ صرف اور صرف اسی کو ان کی ٹیکشن کی بنا پر ہمیں مختار کے فن و شخصیت پر اعتراف دے کر شک کی دعوت دی گئی ہے۔

پڑائے جاساں ہے غالب اس کی ہر بات

مبارت کیا۔ "عبادت" کیا، بدو کیا

بشری رٹن کا پہلا افسانہ "یادوں کے دیے پہلے" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تو ان کی عمر صرف دس برس تھی۔ (وقت یہ وقت میں نے اس لیے دیا کہ خواہمیں دلی دل میں مختار کی عمر کا حساب لگا کر باقی عمر سے سوازیں انہیں وہیر کر سکیں۔ یہ افسانہ ہم نے پڑھا ہے۔ اتنی دلی عمر میں ایسی کچی کچی باتیں کہیں گے، اب نہیں جاسکے جاری منتقل ہوا آئی ہیں۔ پر بہت دیر ہوئی۔ اب مفضل کو مخاطب کر کے ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔

اب عمرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

دس برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو بچہ انگریز بھی کروے تو جیل میں جانا پڑتا۔

چادر، چاندنی، چاند بی بی اور کالم بھر چاندنی

زیادہ حد تک نہیں ہوا، میں نے ایک ادبی تقریب میں اپنے خود ساختہ بیانی کیسپ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ لوگ مزاح نگار سے کوئی سنجیدہ بات سننے کے وہاں نہیں۔ چنانچہ ایک نہایت اعلیٰ پر فضیل شخص نے فرمائش کر کے مجھ سے اسلامی جینٹلمن کے حق میں مزاحیہ تقریر کروائی تھی۔ مالکوں اور محبذوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی اولے چلتا تک بڑا کا مطلب اہل غرض اپنے اپنے طور پر سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ ہمارا شمار بھی اسی زمرہ کو ذہنی نقل کاروں میں ہونا چاہئے۔ اسی زمانے میں ایک تقریب جلسے میں نہایت سنجیدہ مضمون پڑھا جسے مزاحیہ سمجھ کر سامعین نے تپاں بٹا بٹا کرے داد دی، جس سے مرحوم کی روح کو تکلیف پہنچا مگر ان کو ذہن اور جھوٹ کیوں بولوں۔ مجھے خوشی ہوئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شاعر کو اپنے کمزور شعر پر لحاظ دوا سے جتنی خوشی ہوتی ہے اتنی خوشی اچھے شعر پر داد پانے سے نہیں ہوتی۔ اول الذکر تقریب میں ایک بے محل سی بات یہ بھی کہی تھی کہ مزاح نگار اور خاتون افسانہ نگاروں میں ایک ہی بریکٹ میں رکھنا ہوں۔ سبب یہ ہے کہ انگریزی ادبی قلم مزاح نگار کہانے لگے تو پھر غلام، مہرے، غصیف کرنے لگے یا اگر باب سیاست کا "ہوڑا" کا تازہ قصیدہ ہی تعریف کے ساتھ "ہی کیوں نہ لکھتے، بگڑا گئے گا مزاح نگار ہی۔" اسی طرح اگر کوئی لکھتے والی ایک دفعہ "خاتون افسانہ نگار" کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہو جائے تو پھر یہ لٹریل پھٹکے نہیں پھٹے گا۔ اس کے فن پر جو فضائل کا کربق مرادوں نے ایک دفعہ ڈال دیا، اس کا غالب اگر روزمرہ استعمال یا کڑے رد و نمائی سے لیر لیر ہو جائے اور وہ خاتون سرنیکل آپریشن سے جس تبدیلی کروا کے بری ہم جس اور نظر بد دور میری ہم شکل لکھنے لگے ماس کے اگر حضرت محمود شام کی ہی نورانی دماغی اور ہر فیئر فلک جیسی شباب آلود و چھپس بھی شکل آئیں، تب بھی لوگ اس دکھیا کو سابق خاتون

والدین البتہ کچھ کچھ پھرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک اندر یو میں بیان کیا کہ میں بارہ برس کی عمر سے اپنی شادی تک ہا قہودا انری گھنٹی رہی۔ ہم نے اس ڈانری کے بھی اقتباسات لطف، حیرت اور رشک کے سٹے چلے جذبات کے ساتھ پڑھے ہیں۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں قلم پکڑا تو دور کی بات ہے۔ ہمیں تو ڈھنگ سے غلیل پکڑی بھی نہیں آتی تھی۔ چڑیا پر بھی ٹھیک نشانہ نہیں لگا۔ نشانہ آج بھی خطا ہوتا ہے۔ ہاں، چڑیا خودی ترس کھا کر ہمارے قدموں پر آن کے خود گنچی کرے تو اور بات ہے۔ ہم بچہ و مرشد حضرت ممتاز مفتی کی بے نیازش خاک نگاری کے دل سے قائل و قہیں ہیں۔ مرزا انہیں "گریڈ اولڈ مین آف اردو لٹریچر" کہتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے، قلم اور زیادہ جوان بگڑتا جوان ہوتا جا رہا ہے۔ میں انہیں کے اصحابان کیف و حال سمجھتا ہوں۔ وہ دنیا کے سب سے زیادہ تھک و تیز نشے کے عادی ہیں۔ وہ نفل کا شکر کرتے ہیں، جس کا کوئی آثار نہیں۔ ایسے ہی کسی نشے کے بارے میں استاد ذوق کہہ گئے ہیں۔

عبر مغاس کے پاس وہ دائرہ ہے جس سے ذوق

نہ مرد مرد مرد جواں مرد ہو گیا

انہوں نے ایک نئی تخلیق ایجاد کی ہے۔ انہیں ہر شخص کے اندر ایک طوائف نظر آتی ہے۔ اسی گھیدی استعارے کے حوالے سے وہ اپنے ممدوح اور ممدوح کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنے رفیق دیرینہ نئی اشفاق احمد خان کے اندر ٹپٹی ہوئی طوائف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

طوائف کی پرشور کبھی کبھی کھلے گنتی۔ اس لئے نہیں کہ اشفاق کے اندر کی طوائف بہت نما پاں تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ میرے اندر کی طوائف سے زیادہ بڑ گیلی تھی، برتن کار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں گنتی، کسی میں ادھ کھلی، کسی میں مٹھا ابوالنثر (حفیظ جالندھری) میں بالکل گنتی تھی۔ میرے لطفیل میں مستور ہے۔ انتخاب میں ادھ کھلی ہے۔ اشفاق میں گھونگھٹ، نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔

ایک دن میٹھے میٹھے ذلیل آیا کر ڈالا، اپنے کریبان میں منڈال کے پوچھیں تو سہی کہ تمہارے اندر جوڈے سے ادھ طوائف تمہارے نام پر بیٹھی ہے۔ وہ کس حال میں ہے؟ اندر سے جواب آیا کہ طوائف لفظ کے خیال، نئی کے خیال میں ہے۔ قماش جنوں اور ہنرمونوں کے سامنے ہر انہیں کرتی۔ صرف اپنی

ہم مذاق طوائفوں کے سامنے Foot scarp لڑنے کے ناجی کاتی، اجمال ذاتی ہے۔

وہ فیض قریشی سلام کرتی ہوئی رخصت ہو گئی تو ہمیں گریہ ہوئی کہ ذرا سراج تو لگا کریں کہ بشری رحمن کے اندر کون برا انسان ہے۔ کبھی ان کے دم ہاسکی میاں عبدالرحمن تو ہم سب مردان طوائفوں کا مجمع لگائے، پلاٹہ اڑھینے اور آجائے کے آداب پر گفتگو نہ کر رہے ہوں۔ مگر تھکنا لگا۔ پتہ چلا کہ بشری بی بی کے اندر تو گھور دیلا بارہ صفات والی بارہ بشرائیں بیٹھی ہیں اور بارہ کی بارہ میاں عبدالرحمن کے حریف نکاح میں ہیں۔ بارہ دوری میں چادر کا کھنکارے دوڑا تو کبھی میاں کی ملا جلتی اور جھوم جھوم کے خوابہ تمام فرید کے آیات پڑھتی ہیں۔ بارہ دوری کا ہر دور دیکھا ایک تجربہ ہفت ہا میں کھلتا ہے جہاں اس نے قرب نہایت اور کرب آگئی دونوں کا واقعہ پڑکا اور یہ حزن ہوا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ مانگے مانگے کے اس استعارے۔ نہ نثار العجز ہاں صاف جھلکتا ہے۔ درحقیقت ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ خدا اس جوڈے کو نضر بد سے بنائے، مان کی آسودہ از دہائی زندگی کو وہ لوگ بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں انہیں پڑوسی کا ان زیادہ میرا اس پر کھلے مارض کے گلاب زیادہ سرف نظر آتے ہیں۔ سہرے کے پھول پوری طرح مرجھائے سے پہلے ہی وہ ابھار سبز سے سبز تر اور سرخ سے سرخ تر کی تلاش میں دائیں بائیں بھٹکیوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ مرزا مرزا ان کی نگاہ کی دہائیں بتاتے ہیں: کام صغیرہ اور نگاہ کبیرہ۔ میرا نہیں۔ کسی دانائے روز و رات خاندان کا قول ہے کہ شادی ایک ایسی رومینک کہانی ہے جس میں میر و پہلے ہی باب میں مرہا ہوتا ہے۔ نگران دونوں کے کہیں نہیں جیتا نہیں ہوا۔ ان کے ازدواجی رومانس نے آپ حیات نہ صرف دیا ہے۔ بلکہ غسل بھی اسی سے فرمایا جاتا ہے۔ وہ توں میاں بیوی ایک دوسرے کی وجہ شہرت بھی ہیں۔ فقیر تو اس بی بی کو بس بیکار عمارت سے سکتا ہے کہ۔

شوہر شامداد کو اور بھی تعداد کر

بشری بیگم کی ذہانت، فکر و طرازی اور قلم کاٹ سے بڑے بڑوں کا حلقہ بند ہوتے دیکھنا ہے۔ اگر ان کے قلم مرد قلم سے امان پاؤں تو ایک مرتبہ پھر حضرت ممتاز مفتی کا قول نقل کرنے کی جسارت کروں گا۔ نقل کٹر کا شمار کٹر میں نہیں ہوتا۔ چالاک کی اور مہذب بد ذاتی میں ہوتا ہے۔

بشری دشمن جاگیر وادی تھی۔ دشمن تو وہ لڑ تھا۔ یہ رکھ رکھاؤ کی گود میں پلٹی تھی۔ وہ "لیر ولسیا" (چنگاری) میں غارت بدوش کو کہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قابل رحم و مرہم ہوتے ہیں جو اہل خانہ بدوش بھر تے ہیں (تھا)۔ یہ کوئی تھی وہ تو تھا۔ یہ بھڑوہیں تھی وہ وہ ایک تھا۔ شہنشاہ اور شہنشاہ کا میل دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ میں نے دشمن سے پوچھا، یہ سبز پر کی کہاں سے آخذا پایا ہے؟ تو یوں ہمارے نصیب میں سبز پر یاں ہی لکھی ہیں۔ میں نے کہا، اب ہوگا کیا؟ یوں اب ہم اس کی زکشا کریں گے۔ میاں بیوی کے تعلق کے اسرار سمجھتا میرے جیسے کتابی آدمی کے اس کی بات نہیں۔ تنہا کے پیچھے کس نے چوسے ہیں۔ چاکر کس کون کس کی زکشا کر رہا ہے۔ دشمن کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ بشری کی زکشا کر رہا ہے۔ بشری کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ دشمن کی زکشا کر رہی ہے۔ شاید دونوں ہی ایک دوسرے کی زکشا کر رہے ہیں۔

ہم تو اس کا یہ مطلب سمجھ کر میاں عبدالرحمن، بشری کے صحابہ خصوصی اور بشری میاں صاحب کا ہارے شمشیر زن ہیں۔

بشری دشمن ستر کے کسی مرحلے میں بھی خاتمی جلالت کی محتاج نہیں رہیں۔ ڈا ایسے شوہر کی دست نگر جو اپنی انچھیل بیوی کی اس طرح پاسبانی کرے جیسے وکت کیپر ہر وقت وکت کے پیچھے پہ حالت رکوع چوکس کھڑا رہتا ہے۔ وہ ہر حیثیت سے اور ہر میدان میں اپنی خود اعتمادی، ایک وال آدمی، ریاضی حکمت، جرات نگر و اعلا ہر اور بے خوفی کا لوہا منوانچلی ہیں۔ وہ سوچتی مردوں کی طرح ہیں، محسوس عورت کی طرح کرتی ہیں۔ لگتی اپنی ہی طرح ہیں۔ عورت کا سب سے بڑا مسئلہ مرد ہے، جو یہ یک وقت اس کا بدترین دوست اور بدترین دشمن ہے (لغت میں انکی قسم کے معنی دشمن اور شوہر ہیں)

چکارے، چکارے مارے

مارے مارے مارے چکارے

کسی نہ کسی نچ اور عنوان سے یہی دوست نما دشمن اور حریف نما حلیف ان کی تحریر میں بالخصوص گلشن کا لکیری موضوع رہا ہے۔ اسی لئے مردان کے کالم بے سببی، افسید اور اندر پٹے کے ملے جلے ہندے کے ساتھ ایسے پڑھتے ہیں جیسے شہر لڑ کے اپنی اسکوئی رپارٹ پڑھ کر

کہتے ہیں: "ابو اگر آپ ہماری گھاس میں ہوتے تو یہ مس آپ کو اس سے بھی خراب و چرٹ دیتیں۔" دیکھیے زکشا والی ہات اذہر دی رہی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں تو انہیں گلشن نگاروں اور شاعران کو جن مشکلات، شہزاد اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان سب کا سبب اور سر پہ شہرہ حضرت ہیں۔ ادیب یا شاعر و خوش شکل بھی ہوتا تو ان شہزاد کو آپ سوتے ضرب دے دیتے۔ سو سے ہماری مراد سوز ہیں۔ بشری ایک گھنٹی ہیں: "عورت کی زندگی کا کوئی حصہ نہ سکینڈل سے مخلوط ہے، نہ اخلاقیات۔ وہ غریب اگر مذہبی فریضہ سمجھ کر بھی کسی کی بیمار پری کرے تو اسے معاشقہ سمجھا جاتا ہے۔ روٹا اس کا ہے کہ تم بخت بیمار ہو گئی ہو جھٹکتا ہے۔ اس بیماری کو بچاؤ کے لئے اپنے گرد ہڈی، ترش روئی اور نوجوان مجرموں کا دھار کھینچنا پڑتا ہے۔ نقش وئی ہوتا ہے جس کی تصویر امیر خسرو نے کچھ یوں لکھی تھی کہ جب بادشاہ حسن لکھتا ہے تو چہار سو عاشقوں کا ازدحام ہوتا ہے۔ ایک طرف چاہیک سوزا ہوتے ہیں اور دوسری طرف مسکین گدا۔"

سلطان خوباں می دو، ہر سو اہوم عاشقان

چاہیک سواراں یک طرف، مسکین گدا ایک طرف

چاہیک غافل کیا یقیناً، گھوڑوں کی بجائے مستحقین یعنی عشاق کی پیٹھ کی تواضع کے لئے ہوتے تھے۔ اس شعر میں مسکین کا مطلب مسکین ہی ہے۔ لیکن معنی میں ایک دوست نے تاپا کر یہاں ہم صرف ایک بیوی والے شخص کو سکین کہتے ہیں۔

کراچی کی ایک شاعرہ نے اپنے شوہر کی موجودگی میں آئیں بتایا کہ شاعرے میں ان کے شوہر ان کو اس پر مسکین پیٹنے دیتے۔ بالکل آخری صف میں اپنے پہلو میں بٹھا کر خود نثرانے کے سانپ کی طرح لٹدی مار کے جیڑ جاتے ہیں۔ جب نام پکارا جاتا ہے تو وہ ڈانس تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ شعر کی داد کے جواب میں جھک جھک کے "آداب! آداب!" بھی نہیں کہنے دیتے۔ فرماتے ہیں بعضا بعض اس سے بھی excite ہو جاتا ہے۔ کلام سنا کر وہ ابلیس حصار و جیت میں آ جاتی ہیں۔ موضوع نے یہ بھی بتایا کہ جب دو اپنی تازہ غزل کسی رسالے کے ایڈیٹر کے نام پوسٹ کرنے کے لئے اپنے شوہر کو دیتی ہیں تو وہ چپکے سے لغات و محول کر اشعار میں اصلاح کر دیتے ہیں۔ تنگم نے یہ بھی کہا کہ

ی آپ ہنسی رہتی ہے۔

کبھی آپ ہنسنے، کبھی مین ہنسنے، کبھی نین کچا ہنسنے کھرا
مزاح نگاروں کے قبیلے کے سرخیل حضرت حمیر جعفری نے تجویز پیش کی ہے کہ ان کو مزاح
نگار کی کلابالہ برکت مانا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔

اس کی ننگا چادہ، برأت، مسرت اور حیرت کے انبساط سے تربیت پاتا ہے۔ جرأت جیسے
چاندنی بی دروازے پر تھوڑا تھوڑا کھڑے ہو۔ مسرت جیسے کھلی ہوئی کپاس کا کھیت آس رہا ہے اور
حیرت جیسے گھوڑی نے زہرا جنم دیا ہو۔

ہم مرشدی حمیر جعفری سے نہ صرف کئی طور پر متفق ہیں بلکہ اتفاقاً فراموش کریں گے کہ گھوڑی
کے ہاں زہرا پیدا ہونے پر دیکھنے والوں اور خود گھوڑی کو تو تعجب ہو گا ہی، لیکن سب سے زیادہ گھوڑے
کو ہو گا۔

جناب اسماعیل نے بشری رحمن کو باقاعدہ ایک قرارداد کے ذریعے ”اسٹیل پاکستان“ کے
خطاب سے نوازا۔ اسماعیل میں ان کی تصویر بھی، بہترین پارلی میٹیرین کے عنوان کے ساتھ آویزاں
ہے۔ ان کی کچھ تقریریں ہم نے بھی گوش نصیحت نشو سے سنی ہیں۔ تقریر کی اداس طرح سننے بھی
جیسے خوش ذوق سامعین مرصع نزل کے ایک ایک شعر پر واہ واہ کر رہے ہوں۔ بدلہ سچا، حاضر جواب
اور حاضر دماغ ایسی کہ اگر آپ انہیں ٹبرلی نیند سے جگا کر کسی بھی مضمون پر فی البدیہہ تقریر کرنے کو
کہہ کر دیں تو نیم خود گئی کے عالم میں بھی ایسی پر مغز اور گتھ تقریر کریں گی کہ خود ان کی نیم وار نیند
بھری آنکھیں سامعین کی نہ شور مٹایوں سے کھلیں گی۔

اسماعیل میں اور اسماعیلی سے باہر ان کی بدلہ لگی اور حاضر جوابی کے بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔
بڑے بڑے بھکڑا بھیجتی باز اور کتے جیسے مرد جوابی ذہن سوئے فلک اٹھائے، مزہ مارتے پھرتے
ہیں ان کے سامنے چلی نہیں کرتے۔

کف تک ویدم ڈم نہ کھیدم

خونے کے طور پر اور ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے صرف دو مثالیں کافی ہیں:

میرے اشعار میں جتنے بھی نکتے پڑتے ہیں وہ سب شوہر اند اصلاح کے سبب ہیں۔ مزید برآں، جبرو
فراق سے متعلق جتنے بھی اشعار ہوتے ہیں وہ سب گات دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب میں چوہیں
کھینچتا تھا تو کھانے سے لگا بیٹھا ہوتا تو پھر دوری، مجبوری کی شکایت کہیں؟ بیوی جب یہ بیان
کر چکیں تو شوہر نے فرمایا: ”بھئی! مجھے تمہاری پاک دامنی پر ذرا براہ شہ نہیں، مگر تمہارا حرافت پر
کامل یقین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دامن یوسف پر ہاتھ ڈالنے کا سبب پیدا کئی بد چینی نہ سہی، الہامی
حرافت بھی ہو سکتا ہے۔“

حرف مدعا تک آنے سے پہلے ایک واردات قلبی اور بیان کرتا چلوں۔ اس واردات کا
تعلق میرے ہائی پاس شدہ قلب سے نہیں۔ ایک شاعر و جن کی شکل ان کے کلام سے بہتر تھی۔ یعنی
ماہم مست عجب، ملازمت عجب، بیرون ملک مشاعرہ پڑھنے لگیں۔ کچھ دن تو لوگ انہیں مصرع
طرح کی مانند اٹھائے اٹھائے پھرے۔ پھر ایک شخص فہم نہ داد دیتے دیتے شادی کی انگوٹھی پہنا دی۔
اس سانحہ روح فرسا کی خبر سننے ہی ادنیٰ دنیا میں ایسی صحت ماحم چچی کہ اس کا ایک سراپا اور میں تھا تو
دوسرا کراچی میں۔ بعض شعراء نے اپنے عزیز مراد حضرت میں گزارنے کا عہد اعلان کیا۔ وہ سنکھ
ہو پہلے اشعار میں پڑا تھا، اب خود ان پر پڑا۔ مرزا دلاسا دیتے دیتے اور نعم البدل کی امید دلالتے
دلاتے ایسے مایوس ہوئے کہ تھک کر خود صحت ماحم گزاراں میں جا پڑے۔ چھ ماہ بعد وہ پاکستان
آنکس تو جان میں جان آئی۔ ہمارا مطلب ہے، کلام میں جان آئی۔

یہ قہید دل پذیر وغیرت آچار ہم نے اس لئے باعمر کی بشری رحمن کا طرح تھاک و طرح
واردات بالکل مختلف ہے۔ وہ مردوں کو عورت سمجھ کر گفتگو کرتی ہیں اور مرد سے کہیں منٹ سمجھ کر خوش
ہوتے ہیں۔ وہ مردوں سے مرعوب ہیں نہ خوف، زدہ، بے خوف و خطر اندرون و بیرون ملک جہاں
چاہتی ہیں، جاتی ہیں۔ اور جدھر جاتی ہیں، مردانہ کھوکھائی کی طرف پھٹ کر انہیں راستہ دیتا ہے۔
انہوں نے اسماعیلی کے انکسشن بھی لڑے ہیں اور ایک انکسشن میں ہاری بھی ہیں۔ ہارنے کے تقریباً فوراً
بعد ان سے ہماری ملاقات ہوئی، نہ ہرا لگاؤ، نہ کہا تھا کہ ”کچھ لوگ کھڑے کھڑے قہاش نہیں ہوتے۔“ یہ نہ
ٹوٹیں، نہ بکھریں، نہ قہاش نہیں، ہم نے اشارتاً ہمدردی کی تو ”نان کی دیت تھی ہے۔ نہ اپنی ہادھی“ کہہ
کر اپنی ننگی طرح مسکرا دیں۔ ان کی ٹنگلڈ ٹری پسیلوں میں انھی سے گم گدی کر کے نہیں بدلتی، جس آپ

فضل حسین راضی اپنی ترش و تیز فہر سے بازی کے لئے ایک زمانے میں بہت مشہور تھے۔ ایک دفعہ اٹھ کر بوسے بیگم بشری رحمن نے میری بات کو غلط سمجھا ہے۔ میں تو انہیں اپنی ماں سمجھتا ہوں۔ بشری رحمن نے فوراً کھڑے ہو کر بڑی رساں سے جواب دیا: "میں فضل حسین راضی کی بے حد ممنون ہوں کہ وہ مجھے ماں سمجھتے ہیں۔ اس رشتے سے میں ان کی خدمت میں اتنا سزا کروں گی کہ کسی روز گھر آ کر اپنے والد کو بھی دیکھ جاؤں۔"

فقرو اس خاتون کا زچہ نہیں بڑھو بکتر ہے۔

ایک دفعہ ساساڑی طبع کے باعث بشری رحمن بکچون اسمبلی سے غائب رہیں اور اسمبلی سے دور رہتی اور چوچھائی بھی غائب رہی جو ان کی بدلتی جی سے عبارت تھی۔ جب وہ صحت یاب ہو کر آئیں تو وزیر معدنیات غلام حیدر وائیں نے اسمبلی میں بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا کہ محترمہ کی صحت یابی کی خوشی میں، میں ایک شعر ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے ایک نفی غزل کے شعر کو حیران کن انداز میں اس طرح پڑھا کہ بالکل ان کا اپنا معلوم ہونے لگا۔

آج کے روز وہ آئے ہیں بڑی دیر کے بعد

آج کا روز بڑی دیر کے بعد آیا ہے

جواب آں غزل کے طور پر بشری رحمن بولیں: "جناب آفیکر! جناب غلام حیدر وائیں بڑے اچھے سیاح کارکن ہیں۔ آپ کے توسط سے ہندی ان کی خدمت میں اتنا سزا کرتی ہے کہ آئندہ بسوں اور زنگوں کے پیچھے لگتے ہوئے شعر نہ پڑھا کریں اور نہ بخائی قصوں والے ان کو بکاڑ کر لے جائیں گے۔ کیونکہ غنچہ فی قصوں میں ابھی تک ان کی عمر اور ان کے تن و آتش کے سیر و آسے ہیں۔"

مجھے دھندلی کرل محمد خاں صاحب نے بشری رحمن کے سفر نامے "براہ راست" کے قلم پر ان کے طرز و تحریر کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے: "کاش یہ کتاب میں سے کبھی ہوتی۔ میں جا ہوں بھی تو بشری رحمن جیسا ثقافت نہیں کھکتا۔" ہم تو کرل صاحب جیسا بھی ثقافت نہیں کھکتے۔ لہذا بشری رحمن کے نقشب قدم پر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے جب اپنی اور کرل صاحب کی کوتاہ فہمی پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ بشری رحمن کی طرح لکھنے کے لئے دو ایکشتوں اور چار زچکیوں سے گزرنا اور مایاں مہاراجن کی زوجیت میں ہونا ضروری ہے۔ جس سے ہم وجود کا سر جریں۔ اپنے ایک انٹرویو

میں بشری نے کہا تھا کہ "عورت کو خاک کرنے کے لئے صرف ایک بچہ ہی کافی ہے۔" چار بیارے بیارے بچوں کے بعد غولہ خاتم قریہ کی یہ جوانی اس طور خاک ہوئی کہ سرمدہ ختم و انشا راں میں گئی۔ ہم نے بشری رحمن کے سفر نامے "تک تک دیدم تو کیو" اور "براہ راست" پر اسے شوق سے پڑھے۔ ہم باخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ چند برسوں میں یہ تباہ سزا سے جس جن میں سزا پر خوش شکل خواتین کا ذکر انہیں فی الفور اپنے عقیدہ کا کار میں لائے کی خواہش کے بغیر کیا گیا ہے۔ یہ غولہ خاتم قریہ رض الدین کے سفر ناموں میں بھی تھی مگر انہوں نے جتنی غلط فہمی اور بے جا دلجوئی سمجھائی اور وفا کی کاموں کے لئے وقف کر دی۔ انہیں خواتین کا مولانا یہ بھی کہنا چاہیے۔ قربانوں کا ذکر محمدی کرل محمد خاں صاحب کے "بسلامت روی" کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ سزا نامہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے ہر سیرے صفحے پر ایک فی خاتون عزیز ازہان و دشمن ہوش و "کیش" نمودار ہوتی ہے۔ تین صفحوں بعد قضا کے آئیں و خوف ایستہ وہ رشتہ آہ جاتی ہے۔

حیف در چشم زون صحبت بہ آخر شد

ابھی وہ ٹھیک سے دل سے دور دراز آنکھ سے اکھٹ نہیں ہو پاتی کہ ایک اور خاتون مسافر کے ایمان کی آزمائش جاریہ کے لئے نقاب و قی لٹھی ہے۔ کرل صاحب نے ازاد و دینی دل داری ہمیں ان کی جناب میں مؤدبانہ گستاخی کا لائنس دے دیا ہے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے بہت کر کے عرض کیا کہ "کرل صاحب! آپ نے سفر نامے میں مسافر کی ضرورت سے زیادہ ہمیں ڈال دی ہیں۔ آگے بڑھیں میں کم از کم نصف کتھوڑا بہت فارن کچھ بچھڑے دل کر ہا کر کریں۔ اپنے دل پہ چھڑ رکھ کے پوسے۔" یہ بھی کر دیکھا، جس کو بھی لگا ہوا ہوں دور و قی بہت ہے۔

الحمد للہ بشری رحمن کے سفر نامے زبان و الماتی غلطیوں، مردانہ فحشوں اور غور توں سے پاک ہیں۔ یادش بخیر انہم نے بھی ایک طویل سزا سے کا ڈول ڈالا تھا۔ ملکوں ملکوں گھومتے، لیکن چونکہ ہر سفر میں بیوی ساتھ رہیں۔ اس لئے ہمارا سفر نامہ کسی بچنے ہوئے سنیاسی کی تیرتھ پاترا معلوم ہوتا تھا۔ "بچنے ہوئے" سے ہمارا مطلب ہے بیوی تک بچنے ہوئے۔ کئی عمر کے لوگ۔ کئی عمر سے ہماری مراد ہے عمر یاس و ہراس کو بچنے ہوئے سادہ دل بندے۔ کبھی کبھار ہماری طرح جن تباہ، شمشیر برہنہ نکل بھی جاتے ہیں تو۔

سوار رومے انگری میں بیوی یاد آتی ہے
دیکھیے، عالیٰ بنی ہماری طرح، جہاں بھی جاتے ہیں ہمیں محبت، ہمیں لطف سے اپنی پیغم کو یاد کرتے ہیں:-

گلی کئی بار کئے ہیں ہم نے سات سمندر پار
گھر والی سی کوئی نہیں تھی، ماریں ملیں ہزار

ہمارا پسند یہ ہے، یہ خوبصورت اور زینہ قریب وہ پاس لگتی ہے کہ ہر مرد جو کہہ دیتا ہے کہ بکا بکا
وہ چاہا یورپ اور امریکہ میں منزل پہ منزل اور ہر منزل پہ شب خون مار کے گھر لوٹے تو اپنی بیوی پیغم کو
سنائے اور اپنی ٹیک چٹنی اور ٹاپا بیٹا ہونے کے ۱۰۰ میں سے ۵۵ نمبر حاصل کرے۔ ۵۵ نمبر ہر قسم
سے سنائے کے۔ لیکن عالیٰ بنی سے بات بالکل ضد لگتی بلکہ خداے مجازی لگتی تھی ہے۔ ہم نے بھی سارا
یورپ ہر نظری کی چھلٹی سے کئی بار چھان مارا، لیکن صاحب! تو یہ کیجئے، ہماری Coloured پیغم کا
مقابلہ Colourless چڑھلیں کیا خاک کریں گی، ہمیں تو اپنے جیسے ہاک نقش اور رنگ والا مرد ایک
سارے یورپ میں ایک بھی نظر نہیں آیا۔ سندر رات تو بہت دور کی بات ہے، ہماری خیر و عافیت تو کسی
نہری عورت نے بھی نہ چوچھی کہ ”پر دہی! اور پلاڑی کیوں کو جیتنے سے لگائے بولائے بولائے کیوں پھر
رہے ہو؟ میں تو صرف ۲۵ پوٹ کی دوری پر ہوں۔ قندہ دراصل یہ تھا کہ آٹر ہاؤس کو دیکھن، سنگ وہی
سدا سہاگن۔ جد تو یہ کہ نہری عورت ہمیں عزیزہ کشور نامہید کی نام نہاد پاپ جیتی ”نہری عورت کی کٹھا“
میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملی۔ اس کتاب کو ہم نے بڑی بے صبری سے ایک رات میں پڑھ ڈالا۔
اس میں نہ سے مردانیت نظر آئے۔ لیکن نہ سے مردوں کو دیکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے کتاب
پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا تو جب بھی کسی گناہ کار آدمی کو دیکھنے کو بی ہوتا ہے تو کتاب پیغم کے
آکھنے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مولوی محمد اسماعیل نے بچوں کے لئے جو کچھ لکھی تھی، اسے سب
حال کر کہہ سکتے سمیت پڑھتے ہیں:

آئینہ دیکھئے گو آنکھیں بنائی تو نے
آنکھوں سے دیکھئے گو انسان ہمیں بنایا

لیکن اس بی بی نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور آئینہ تحریر میں ہمیں بہت کچھ
دیکھایا۔ دیکھیں وہیں گلی اور گھر گھر کھوی، پر اپنے وطن کے موتیا اور صحرائے چولستان پر اترتی خشک چاندنی
کو نہیں بھولی۔ لندن دیکھا، پیس دیکھا، امریکہ اور کینیڈا کے کبھی شہر دیکھ ڈالے، پر وہ جو عالم میں
انتخاب ایک شہر ہے، وہ ان کے وجود میں خوش ہو کی مانند بسا ہے۔ سب کچھ دیکھئے اور ایک ایک منظر
دیکھانے کے بعد انہیں:-

ستلج پر اپنا وہ شہر پرانا اچھا لگتا ہے

”منزل عشق پہ تھا پہنچنے“، ”باؤلی بھٹکان“ اور ”سمیٹا جاہ بٹلے گزر کن“۔ جج اور
عمرے کے سفر نامے ہیں اور ایک کیفیت قلبی کی روداد بھی۔ ان کے سفر ناموں کی سب سے بڑی خوبی
وہی ہے جو کسی بھی کتاب کی ہونی چاہئے۔ یعنی readability جس کتاب میں یہ خوبی نہ ہو تو
یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر لینا چاہئے تاکہ پرہیزروں کو عبرت اور وسیلہ معاش مہیا
ہو۔ readability کا ترجمہ پروفیسر قاضی عید القدوس توشیف مطلقہ کرتے ہیں۔ اس میں واقعی
ترتیب کی خوبی پائی جاتی ہے، یعنی اصل سے زیادہ گنگل اور ناقابل فہم ہے۔ بشری pen and
link والی دیوہیز ہار کیوں سے تصویر کو گراں یار نہیں کر میں۔ وہ دیکھتے دیکھتے بٹلے رنگوں سے اپنے
قاری کو ہر ملک سے قریب بہ قریب، کوچہ کوچہ، چہرہ پہ چہرہ و شناس کراتی ہیں:

نہ آئی فقہ کر کے درشن میں تھا

لگھا ائی آنکھوں میں ساری گمریا

(شعی صاحب سے معذرت کے ساتھ)

اپنی خطابت کے حوالے سے وہ بلاشبہ وطن پاکستان میں۔ سفر ناموں کے حوالے سے ان
بطلوت بہت مشہور ہے۔ ایک مداح کی تجویز ہے کہ بشری بی بی کو طوطی کے علاوہ دوسرے بھونٹی کا خطاب بھی
دیا جائے کہ ان دونوں میدانوں میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

انہیں نازک مقامات سے آسان گزرنے کا فن آتا ہے۔ اچھا ناول یا افسانہ نگار جو کتابوں
دوسروں یعنی اپنے گرواردوں کیلئے ضرورت نہ سمجھتا ہے، اس میں گرنے سے اپنے فن کو..... اور خود کو

اٹھاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ انہی سائیں تک پہنچا دیتی ہے۔

مرزا ایک زمانے میں بکری کے گوشت کے بغیر لقمہ نہیں لے سکتے تھے۔ قنجن یعنی وہ چھٹے چاول جن میں گوشت ڈالا جاتا ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار ان ہی کے ہاں چکھا، جس کی کمر بستہ آج بھی ذہن و زبان پر باقی ہے۔ پھر ایک دن سنا کہ ہرزہ شاکی قلعہ سات سے ان کا قلب ایسا گداڑ ہوا کہ یکا یک وہی تیرین ہو گئے اور بکری واپسی نظروں سے دھیسے گئے کہ کوئی بکرا کچھ لیتا تو وہیں سینکڑے گھوٹ کے ان کا خون گرد پڑتا۔ یہ سب کچھ ہوا پر گوشت کی بڑک نہیں گئی۔

idealist یعنی آدرش پسند آدمی ہیں۔ وہ کوئی ایسی فلسفاتی ترکیب دریافت کرنا چاہتے تھے کہ بکری کو ذبح کے بغیر اس کا گوشت نکال لیا جائے۔ یہ بھون بھون کر رہا تھا۔ بکری بشری رہن کی انتہائی محبت، عقیدت اور ہر مندی سے لکھی ہوئی Obituaries (وفیات) پڑھ کر یاد آیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر کرم حیدر پر ان کے دل گداڑ تو جتنی مضمون پڑھ کر مرزا کہتے۔ لگے کہ یہ کیا ممکن ہے کہ میر سے فوت ہونے کے بعد وہ مجھ پر ایسا کالم لکھ دیں۔ اس پر پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی بی اپنی منشیانہ زبان میں بولے کہ بڑا درمن افواجی می سے پہلے آبدیدگی ممکن نہیں۔

بشری نے اپنی صاحب دیوان والدہ مرحومہ اور دیگر مرحومین..... احمد علی تالیور، سید شہ نواز، آسمانی تصدیق، شاد فاطمہ اور پروفیسر کرم حیدر کی پر زندہ رہنے والے مضامین لکھے ہیں۔ جب ہمارا کوئی صاحب محبوب یا عزیز ساتھی رخصت ہوتا ہے تو ہمارے اپنے وجود کا بھی ایک حصہ مرجاتا ہے۔ پھر جب بھی ہم اسے محبت اور بھلائی کے ساتھ یاد کرتے ہیں تو نہ صرف وہ زندہ ہو جاتا ہے بلکہ ہمارے وجود کا بھی حصہ وہ بن جاتا ہے اور ہماری امتداد ہے۔

نہیں اسماں مرزا نہیں
گور بیلا کوئی نور اسے

بشری نے اپنے مرحوم خسر کا انا مال خاکہ جس محبت اور درمندی سے لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سانس سہر، موسم اور حکومت کے خلاف لکھنے کے لئے وہ ماغ پہ زیادہ زور نہیں دیتا پڑتا۔ ہاں ان کے حق میں بھر خیر کہنے کے لئے بڑی کشادہ دلی، جرأت اور جھٹ اوقات موٹی کھال

صاف بچائے جاتا ہے۔ اپنی خصوصیت euphemistic تنک (خوش لفظی، سخت، تجلی یا مے دروں کے بدوں کیفیت کو ملائم و گوارا انداز سے بیان کرنا) کو انہوں نے جا بجا ایسی خوبصورتی اور فن کارانہ مہارت سے برتا ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ بعض inhibitions کو بڑی دلیری اور چابک دہی سے کبھی اپنے ہیرا تراش فقروں سے اور کبھی حسن ادا کے مٹلی بی اے سے توڑتی چلی جاتی ہے۔ عزیز یونس بت ایک صاحب اسلوب، ذہین اور نو جوان مزاج نگار ہیں۔ ہم نے جب ان کے ایک مضمون میں یہ پڑھا کہ بشری رحمن کی کہانیاں پڑھ کر ”بندہ متاثر ہوں ہو، بالغ ضرور ہوا چاہتا ہے“ تو یہ عقدہ کھڑا کہ نو دانشی یونس سطر کے راتوں رات کھنکھناتی تھی، سوچیں کیسے نکل آئیں۔

یہ ام بھر میں کیا ماجرا ہو گیا

کہ چہرے پہ ہنگل کھڑا ہو گیا

وہ خود رقمطراز ہیں کہ ان کی صحت ایسی تھی کہ گوجر والہ کی روایت کے مطابق ورزش کے لئے اکھاڑے گئے تو استاد پیلوان نے دیکھ کر کہا: ”تمہاری ورزش کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ روزانہ دو کشتیاں دیکھ لیا کرو“۔ بالفاظ دیگر بشری رحمن کی کہانیوں نے Male Hormones کے انجکشن کا کام کیا اور وہ قریب از وقت سن بلوغت کو پہنچ گئے ورنہ نہ جانے کب تک گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلنے پھرتے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض چائے کی کیتیاں ایسی ہوتی ہیں کہ پانی اُبال کے درجے پہ پہنچ کر کھد بد کرنے لگے تو ایسے زور سے سیٹی بجاتی ہیں کہ اہل محلہ تک خبردار ہو جاتے ہیں کہ کسی کا پانی جوش مار رہا ہے۔ ہمارے یہاں بعض ادیبوں اور شاعروں کی کیتیاں جھٹھ سے بخار پانی سے ہی سیٹی بھانے لگتی ہیں۔ قبر کا حال مردہ ہی جاتا ہے اور جوانی کا حال خدا اور خود پرور جن ہوتا ہے۔ خدا گواہ ہے۔ ہمیں تو اپنے بالغ ہونے کا علم صرف ایک تاروں بھری رات کو چائے تک اس وقت ہوا جب قبہ والد صاحب نے ۳۰ شعبان کو انیس اطلاع دی کہ صبح سے تم پر نہیں روزے فرض ہو گئے! وہ مطلع نہ کرتے تو کون جانے ہم آج حکم عالم بے خبری میں بالغ ہونے کے کار بھر رہے ہوتے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم نے اپنے بے فصل میوہ ہائے جوانی کو خواتین کے افسانوں کی پال میں لگا کر نہیں پکایا۔ تاہم ہمیں یہ جاننے کی گریہ ہوئی کہ یہ نسل بالغ ہونے کے لئے کیا کیا جتن کرتی اور کیسے کیسے کشت

اور اتنی ہی موٹی نظری کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی محبت اور سعادت مندی کا ثبوت ہی نہیں، قلم کا بھی اعجاز ہے کہ انہوں نے ایک مرحوم بزرگ کو زندہ لاکر کھڑا کر دیا۔ دیکھنے والے اس تصویر پر سناٹا کش کے پھول چھاد کر رہیں گے۔

ایک ان ہم نے اپنی بہو کو یہ خاکہ پڑھوایا۔ بہت پسند آیا۔ ہم نے کہا کہ دیکھ لی بی! ایسی بھی بہو ہیں ہوتی ہیں جو اپنے فخر کی ایسی تعریف کرتی ہیں۔ کہنے لگیں۔ مگر ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ ناول ہو یا افسانہ، سیاسی نظریہ ہو یا ہنر و ادب، ہر قسم کا علم، فنی نظم (Feminism) کی ایک ذمہ داری ہے۔ ہمیں فنی نظم سے کوئی کدیا جڑ نہیں۔ لیکن جی نسبت خواہتا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ وجہ یہ کہ ان سے اختلاف کیا جائے تو خفا ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ متفق ہو جائیں تو اور زیادہ خفا ہوتی ہیں۔ خواہش رہیں تو اسے مردانہ شائرم کا حیرانہ ٹیوٹو لٹا کر اس انداز سے ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں کہ بالکل ناگوار لگتا ہے۔ ناول سے ہماری مراد ہے کہ میاں بیوی کا سا ڈانٹا لگ لگتا ہے۔ میاں بیوی کی گھبراہٹ کی جنگ میں فتح ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو پہلے رووے۔ میری گوریلی ایک مشہور فنی نسبت ہو گزری ہے۔ اس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس تین pets (پالتو جانور) ہیں، جو شوہر کا مکمل ختم لہا لہا ہیں۔ ایک کتاب ہے جو صبح سویرے سے غراتا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا طوطا ہے جو سہ پہر ہونے ہی دلی رنائی کا لیاں بگنے لگتا ہے۔ تیسرا ایک چلا ہے جو رات کو دہرے سے گھراتا ہے۔ محترمہ ہمارے سامنے یہ بات کہتیں تو ہم عرض کرتے کہ آپ نے شہر کے ختم لہا لہا کے طور پر جانور بھی پالے تو بد ذلت نہ پھر یہ بھی ہے کہ تینوں کے تینوں کماؤ، آؤ اور آؤ ان ہار ہیں، کماؤ ایک بھی نہیں۔

لیکن بشری زمین اپنے فنی نظم کو چادھا نہ دے۔ یا معنی آویش سے آلودہ نہیں ہونے دیتیں۔ دھوٹے کی طوطا جیسی اور بے کی شب خرابی کی تصویر تو کھینچتی ہیں مگر۔ نگے میں کتنی بات سچی ہیں، نہ ناگف توڑنے کی جھلکی دیتی ہیں۔ مرد نے جو ویز چاؤ..... مردی سے محفوظ رکھنے کے لئے..... عورت کو زندہ لاکر چادھا لہا لہا کا عورتانہ حسد اس کے گرد کھینچ دیا ہے، اس کے مل برابر روزن سے چشم حیران کو مردوں کی جالی ہوئی، نیا کبھی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ کالموں کے

اس مجموعے میں مثال خجروں سے بھی ہوتا ہے۔

ترے آزاد بندوں کی تیرے دنیا نہ وہ دنیا
مولانا نعیم صدیقی کی کتاب "عورت معرض کش مکش میں" کے مقدمے میں عورت کے فرائض اور مرد کے لہذا اندیشے کے بارے میں لکھتی ہیں:

گو یا اصل اور حقیقی عورت اس عورت کے اندر ہوتی ہے جو بلا پر نشین نظر آتی ہے اور دنیا کے ہر مرد کو ہی اصلی عورت دکھا رہے جو باور پنی خانے میں ہو تو رسوائی سے اس کے ہاتھوں کی خوشبو نکل رہی ہو۔ ڈرائنگ روم میں ہو تو اس کی خوبصورت انگلیوں ماحول میں دھنک رنگ چٹاں بر ساری ہو..... اور اگر بے ہمتی کے لمحے میں ہو تو گویا الف لیلوی رات آسمان سے آخر کمر پر بکھر جائے۔ خود سے الگتا ہوا زمانے سے لڑتا ہوا طوفان کی طرح ہجرت اور چٹان کی طرح چٹنا ہوا مردانہ عورت کے آئین کی عینک سے ہر صبح صبح سلامت نکل کر روزگار کے سمندر میں کودتا ہے اور ہر شام پیرے پر نئی فراٹیں لئے پھر آئی کا سہارا لیتا ہے۔

وہ بار بار بڑے رخ اور مختلف پیشتر سے اپنے اصل موضوع یعنی عورت کی مظلومیت کی طرف پلٹتی ہیں۔ رقص کی ایک قدیم اصطلاح ہے۔ "تیر و تانی"۔ وہاں کمال رقصہ جو تیر و تانی پر تاج لگتی ہے "تیر و تانی" کہلاتی تھی۔ بشری نے اپنی کہانیوں میں دکھایا ہے کہ ایک گزشتہ عورت کو اپنے خداوند مجازی کے سامنے تیر و تانی سے بھی زیادہ تالوں پہ نچنا اور تھپنا تھپنا کر کے بے وجہ روٹھے ساجن کو متاثر کرتا ہے۔ ہاؤس کے آبلوں کی سوزش کے باعث منہ سے نکلنے سسکیوں کو پاگل کی جھپکار اور اپنی جھپکار میں چمپا کے کان پر بھی آتی آپ کچھ لپکتی ہے۔

کسی زمانے میں کالم نگاری ہمارے ہاں محض مشکلہ شوق اور ذریعہ عزت ہوا کرتی تھی۔ اب ماشاء اللہ جیلہ معاش اور کس وقت کی وسیلہ رسوائی بھی ہے۔

کالم تمام حلقہ دامن خیال ہے
کالم نگاروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ روز کواں کھودتے اور روز پانی نکالتے اور پلاتے ہیں۔ لیکن جب سے سیاسی Polarization (قطبی حاد آرائی) نے شدت اختیار کی ہے،

کالم نگاروں کے حراج و حیاں میں بلائی برہمی کوئی درستی ہے۔

صفحہ صفحہ روتا ہوں کالم وحشت ہے

اہلِ عیال کا تو یہ احوال ہوا کہ روزِ نکاح کھڑے اور روزِ اس سے یہ سب بے کار وہاں برآمد کرتے ہیں اور یہ ہوسٹ وہ ہوتا ہے جس کو انہوں نے کل شام ہی سب خاص سے کنویں میں دھکا دیا تھا۔ بشری کنویں سے خواب لے لیا برا آمد نہیں کرتیں۔ وہ اپنے ڈول سے سادہ پانی ہی لکھتی ہیں۔ غذا اٹھا گا ہے مانتے اس پانی کے سوتے آسپ آہنِ تاب سے چاٹتے ہیں۔ جس میں لوہا گرم کر کے بچھایا جاتا ہے۔ اس دور میں سیاست اور انسانی اقدار کے درمیان ایک آدمی کو پہنچنے کی اقدار حائل ہو گئی ہے۔ بشری دشمن نے اس فلیج کو بہت قریب سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ سیاست کی برائیاں اور ریشہ و انتہوں کو وہ اپنی سیاسی دانشمندی سے ہٹ کر بھی دیکھتی ہیں۔ یہ مٹی سیاست اور طرزِ تپاک دیکھا ہے اپنے ایک حالیہ کالم میں لکھتی ہیں کہ وہی لوگ جو انکیشن سے پہلے جڑ و عمار کا جیکر ہوتے ہیں، سوٹ لینے اور وزر پہنے کے بعد ان کی گردن میں سریا لگ جاتا ہے! ہم اسی مفہوم کو عامہ اقبال کے شعر میں ادنیٰ تصرف کے ساتھ یوں بیان کریں گے۔

بندہ و صاحب و محتاج و فتنی ایک ہوئے

جیری سرکار میں پچھتے تو کبھی شیر ہوئے

اپنے کالموں کے مجموعے ”چادرِ چار دیواری“ اور ”چاندنی“ کی تقریب رونمائی پر بشری دشمن آمادہ نہ ہوئیں۔ لہذا اس شام کی محفل کے انعقاد پر احباب نے انہیں رضامند کیا، ہم مصنفہ سے متعلق ہیں۔ رسمِ اجراء کے روز پر ہم نے تو آج تک کوئی کتاب کبھی نہیں دیکھی بلکہ بعض کتابوں کی رسومِ اجراء پر تو آخری رسوم کا گمان ہوتا ہے۔ تقریب رونمائی آخری و یارِ گارت ہوتی ہے۔

ہم ان کے بے حد مصنون ہیں کہ وہ ایسے بڑا خوب زمانے میں اس اوداس شہر میں تشریف لائیں۔ جب حال یہ ہے کہ کرکٹ ٹیچ کے دوران کوئی پچھتا ہے کہ آج کا سکور کیا ہے تو لوگ اسے گرنے والی واکوں کی تعداد بتانے کے بجائے مفلکوں کی تعداد بیان کرتے ہیں۔

کچھ دن ہوئے، مجھے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ گجرات برس پہلے نیکر ٹریٹ کی شہ

تاریک نگاروں دارِ پان دیکھ کر جو وحشت مجھے ہوئی تھی، وہ اب وحشت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ باخبر لوگ ان راویوں کو Corridors of Power کہتے ہیں۔ میں اس کا ترجمہ ”کالم نگاروں کا زمانہ بادشاہ گراں“ کرتا ہوں۔ ان سے دوست اور گرم فرما الطاف گوہر صاحب اسلام آباد کو انہوں نے ”گوا“ کہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہوس گوا کی اصطلاح انہوں نے ہوس گوا کی وضع پر بنائی ہے جسے ہم نے شعر میں استعمال کیا ہے۔ سو یہ ہوس گوا عام و خواص پیشانی و رخسار سے اترتی آرتی اب بادشاہ گروں کے پائے مبارک پائے ٹھہرتی ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ چھ دن ہوئے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ پوچھتے والوں نے ہم سے جس انداز سے کراہی کا حال پوچھا جس میں پشیمانی احوال پندرست سے زیادہ ہلچل کا رنگ تھا۔ جو سوال بھی وہ کرتے تھے اس میں ان کے اپنے جواب کی آمیزش تھی۔ انداز میں جھنجھٹا ہٹ، کوئی ڈیز جلد برس پہلے غائب نے کہا تھا۔

نہ پوچھ حال اس انداز سے اس مقام کے ساتھ

لیوں پہ جان ہی آجائے گی جواب کے ساتھ

لیکن جواب پر ہی اصرار ہے نفسِ صاحب کی زبان کی مرض ہے

یہ خونِ خاک نھیں تھارزقِ خاک۔ سو

ایسے بھی سراجِ رساں ہیں جنہیں مقتول کے حق میں خود قتل ہی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ گویا:

وہی قتل بھی کرے ہے، وہی نے قصاص اٹا

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک بظاہر سیدھے سوال کے جواب میں عاجز رہنے ایک منٹ

اور ایک سانس میں ایک شعر اور دو مصرعے پڑھ دیے۔ جب کوئی شخص کسی سوال کے جواب میں اس

طرح شعر پڑھنے لگے تو اس کی تین باتیں ہوتی ہیں: اول، ہوتا ہو وہ شعرا خود ہی کے ہیں۔ خواب

شعر کہنے اور اس پر ادھر طلب کرنے کا شمار ہے۔ بال Human Rights میں ہوتا ہے۔ دوم، کسی

کے عشق میں جلا ہو گیا ہے اور اپنے ”نا قابلِ اشاعت“ مذہب کا اظہار میں نہیں کرنا چاہتا۔ تیسری

وجہ یہ ہے کہ کلامِ اعلاٰ حق یعنی حق بولنا اس کا ایمان ضرور ہے۔ مگر وہ پلس ”کچھ والی“ نہیں دیتا چاہتا۔

ہوں کہنے کو ہر شخص اس امر کا اظہار اعلان کرتا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ کراچی شہر کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے۔ امن کے گہوارے کی نشت سے کانچکے تو ایک دن میں خیال آیا کہ ذرا دشمنی میں گہوارے کے معنی تو دیکھیں۔ علی الاصل سے رجوع کیا تو یہ معنی نکلے:

گہوارہ: بچوں کو سکانے کا جھولا۔ وہ چار پائی جس پر عراب لہا لکڑیاں لٹا کر عورتوں کا بیٹا زولے جاتے ہیں۔

ہم ان معنوں سے ایسے بوکھلائے کہ پھر ”امن“ کے معنی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان لغت نویسوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ سب سچ مگر ان باتوں کا تعلق ان کی شام سے کیا ہے؟ تو صاحبو! سچ بات یہ ہے کہ بشری رشتوں تو تعارف کی محتاج نہیں۔ میں نے موقع قیمت چاہا۔ سوچا، کیوں نہ اپنے شہر کراچی ۱۹۹۵ء کا تعارف ان سے گرا دوں، جس کے ادیب، دانش ور ادب دوست شہری آج شام ان کے لئے گلے بدایاں ہیں۔ صاحب طرز ادیب اور جدید نسائی حسیت کی ممتاز ترجمان ہونے کے علاوہ وہ ایک نریک، وپا اثر سیاست دان اور انجمنی مقبول و معروف کالم نگار بھی ہیں۔ امید ہے کہ کراچی میں ایک مدت بعد ان کا ورود و قیام موجودہ صورت حال کا معرہ بھی تجزیہ کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

مولانا گرامی جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حقیقت ہوشیار پوری نے ایک شعر نگاری میں کہا تھا، جس کا مطلب دیکھ لیں ہے کہ اسے صبا، محضرت اقبال سے چاہیے کہ تمہارا گرامی جان سے گزر گیا اور تم ابھی تک خاموش سو۔ اس شعر کے صرف تین الفاظ بدل کر میں بشری رشتوں کے بعد دانہ تو سنا سے لاہور کے ادیبوں اور دانشوروں کو یہ پیغام پہنچانا چاہوں گا۔

صبا! ہر لحظہ لاہور میں پیام دو
برشت جان گرامی و تھو بنو خوش!

شاہ جی کی کہانی، دوسرے شاہ جی کی زبانی

صدور گرامی قدر، خواتین و حضرات!

شفیع عقیل داتا و جیاں ویہ اور درویش سیریا و ریش ہیں۔ اس تقریب دل پذیر کے لئے انہوں نے مرقعہ دستور اور روایت کے مطابق ایک سر پرست اعلیٰ ایک صدر، ایک مہمان خصوصی اور ایک مہمان اعزازی کو زحمت دینے کی بجائے چاروں کو کمری صدارت پر بٹھا دیا۔ اس خوش گوار حالت ہم نشینی و مسادات مہمبی کو Presidium یا مجلس صدارت کہتے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود قوام

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

نظر بدور، شفیع عقیل دیکھیں سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایسے طرح دار مصنف اور اس کی تصنیفات کا احاطہ کرتا ایک صدر کے بس کا کام نہیں۔ آئی کل وفاقی دستور کے ضمن میں Checks and balances کا بہت بچہ چاہیے۔ اگر دستور پاکستان میں بھی ایک کی بجائے چار صدر ہوتے تو حیران ہوتی ہار بارز ادبی آئی ہے وہ نہ ہوتی، مثلاً خاں صاحب نے۔ ہر مطلب ہے اسحاق خاں نے وہ خود سر پرانہ مشروں کو کھڑے کھڑے ڈس کر دیا اور دونوں اپنے مشروں کے سرال پر ایک آنسو نل نل کر انجمن تعارف کے خوب صورت شعر کا وزن کرتے ہوئے دیکھے گئے

تھو سے بھڑ کر زندہ ہیں

خان بہت شرمندہ ہیں

پانچ سال ہونے کو آئے، میں نے اعلان کیا تھا کہ میں ادبی احکاف میں ہوں،

ہذا اس معنوں کے پیش از ہر شفیع عقیل کی جس کتابوں کی تقریب ان میں پڑھے گئے جو ۳۳ مارچ ۲۰۰۰ء کو پریس کلب کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔

صداوت سے معذور سمجھا جائے، کتابوں کی رونمائی کی تقریروں میں مضمون پر ہٹنے کا نہ حوصلہ اور ملحقہ نہ استعداد، آئی احکامات عقلی کے بارے میں اس اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ:

ایسا ہے ۱۶ شوق مجھے حیرت سے باہر

زندگی میں صرف ایک ہی رونمائی میں بد رضا و غیبت جگہ بدلی فرصت شرکت کی ہے۔ مگر وہ غیر کتابی رونمائی تھی یعنی اصلی اور نتیجہ خیز۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کی دعوتیں خالی اور ملت و مصلحت نہیں ہوتیں، مثلاً رونمائی ہی کو بچنے کے واسطے اس وقت تک اپنے چہرے سے عیب پوش سہرا نہیں ہٹاتا جب تک رسم نکاح کا نوٹا نہیں ملتا۔ وہ چائے اور دہن کے گواہ اور ویل آکر سب کے سامنے یہ اعلان نہ کر دیں کہ وہاں نے قبول کیا۔ اسی طرح وہ لہذا دین ایک دوسرے کی شکل و صورت کو آئینے کی خرابی اور روشنی کی کمی پر محمول کرتے ہیں۔ ہماری پانچویں اور آخری ذرا تعریف کتاب کے بارے میں ہمارے یا طرح واد مرزا عبدالودود ایک کی تجویز ہے کہ اب یہ لازمی قرار دینا چاہیے کہ تقریب اجراء کے دوران مصنف بہت دیر اور کچھ ہوا سہرا لٹا کر رہے گا تاکہ سامعین اسے شرافت نہ کر سکیں اور وہ ان کا فطری رد عمل دیکھ کر ہراساں نہ ہوں۔

شفیع عقیل نے جب ازراہ محبت مجلس صداوت میں شمولیت کی دعوت دی تو میں نے عرض کیا کہ مجھے تنقیدی یا تقریبی مضمون لکھنا نہیں آتا۔ دل کے آپریشن کے بعد اکثر لوگوں نے تقریر پر بھی پابندی لگا دی ہے۔ گو یا تقریر و تحریر دونوں سے معذور۔ بولے: "اسی لئے تو آپ کو دعوت دے رہا ہوں۔ آپ کو قطعاً دیکھ کر بتایا کرنا نہیں ہوگا، بس یاد دہراؤ۔ اسے خاموش بیٹھ دیے گا۔"

عرض کیا: "حضرت! آپ مجھے تقریب اجراء کی صداوت کی دعوت دینے آئے ہیں یا صداوت مملکت کی؟"

مجلس صداوت میں جو معقول عذر کے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ میں نے تقریب اجراء میں حعارف ہونے والی چیزوں کتابوں میں سے ایک بھی نہیں پڑھی۔ کتاب پڑھنے سے پہلے اگر اس پر گفتگو کروں گا تو بالکل الہامی معلوم ہوگی جس پر ضعیف اعتقاد و سامعین ایمان نہیں لائیں گے۔ پڑھنے کے بعد کوٹ بولنے کے لئے دلگی ذہانت درکار ہے۔ جس کا میں دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ بقول بے شاہج:

جو کچھ آکھان تے کچھ بچھا اے

جی آکھان تے بھانیز بچھا اے

مطلب یہ کہ جھوٹ بولنا ہوں تو پھر کبھی کبھ پتا ہے، کچھ کہوں تو شرط بھڑک اٹھتا ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے محرومی کا فوری ازالہ تو انہوں نے اس طرح کر دیا کہ وہ کتابیں

بھر عرض کیا کہ میں ذاتی پر بت جا خاموش بیٹھا ہوں، یہ مجھے قبول نہیں اس لئے کہ بت کا بھاری بھر کم اور قوت گویائی سے محروم ہونا ضروری ہے۔ پوچھ جانے کی اہلیت رکھنا بھی لازمی ہے۔ یہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں کہ میں علمی و تنقیدی مضمون لکھنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ نیز آپ کی ہر جہت اور جامع اہلیات شخصیت سے صحیح معنوں میں واقفیت نہیں۔ کہنے لگے: میں اپنا اتعارف آپ

بھر عرض کیا کہ میں ذاتی پر بت جا خاموش بیٹھا ہوں، یہ مجھے قبول نہیں اس لئے کہ بت کا بھاری بھر کم اور قوت گویائی سے محروم ہونا ضروری ہے۔ پوچھ جانے کی اہلیت رکھنا بھی لازمی ہے۔ یہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں کہ میں علمی و تنقیدی مضمون لکھنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ نیز آپ کی ہر جہت اور جامع اہلیات شخصیت سے صحیح معنوں میں واقفیت نہیں۔ کہنے لگے: میں اپنا اتعارف آپ

بھر عرض کیا کہ میں ذاتی پر بت جا خاموش بیٹھا ہوں، یہ مجھے قبول نہیں اس لئے کہ بت کا بھاری بھر کم اور قوت گویائی سے محروم ہونا ضروری ہے۔ پوچھ جانے کی اہلیت رکھنا بھی لازمی ہے۔ یہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں کہ میں علمی و تنقیدی مضمون لکھنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ نیز آپ کی ہر جہت اور جامع اہلیات شخصیت سے صحیح معنوں میں واقفیت نہیں۔ کہنے لگے: میں اپنا اتعارف آپ

اسی وقت مرحمت فرمائیں اور تیسری کئی رات کو۔ خود صاحب کتاب سے ملاقات بڑی باقاعدگی سے ہر پانچویں برس ہوجاتی ہے۔ مرزا کا قول ہے کہ جب کسی دوست یا آشنا سے عرصہ دراز تک ملاقات نہ ہو تو یقین چالو کہ وہ کراچی ہی میں ہے اور شہریت سے ہے اگر لاہور یا کئیں اور ہوتا تو ضرور ملے آتا۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ اسی لئے ایک دوسری کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

شفیع عقیل مجھے "شاہی" کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "خال صاحب" کہہ کر میرے درجہات بلند کرتے ہیں۔ میرے عزیز اور بے تکلف دوست سرور حسن خاں مجھے "سید صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے سید صاحب کیوں کہتے ہو؟ فرمایا کہ معاف کرنا، جب پوسٹی کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ملکر رہا ہوں۔ اس لئے کہ حضرت پوسٹ سے تہرہاری نسبت اور مشابہت صرف نام کی حد تک ہے۔ تمہیں دیکھ کر دنیا کی سہیلیاں بھی چا تو سے اپنے ہاتھ تھیں کاٹیں گی۔ بیوقوفی کا نہیں گی بلکہ بعض بعض تو یہ تک کاٹنے سے انکار کر دے گی۔ میں نے شفیع عقیل سے پوچھا، بندہ پرورا آپ مجھے شاہی کیوں کہتے ہیں جب کہ میں نے تو عا شا دہلا اپنے سوا کبھی کسی کو گمراہ نہیں کیا؟ فرمایا: خدا کی قسم میں آپ کو شاہی احترام نہیں کتنا بخش عادی کہتا ہوں۔ (یعنی مقصود اس سے عزت و تعظیم نہیں مجھے) گذرانور، چہرہ اسی اور ماسی کو بھی شاہی کہہ کر ہی بلاتا ہوں، دو تو برا نہیں مانتے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تو میں ایک کانفرنس کے دوران ایک سردار جی سے ملاقات ہوئی۔ میں انہیں بھی شاہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ بہت خوش ہوتے تھے۔ وقت رخصت انہیں کہہ ہوئے۔ پھر مجھے اپنی بڑی تو دیکھی سے release کرتے ہوئے کہنے لگے کہ زندگی میں پہلی بار کسی نے عزت سے پکارا ہے اور نہ سردار جی اور سردار جی اسٹے میں سے ہر دو کا نیک گئے۔

اب میں بھی شفیع عقیل کو شاہی کہنے لگا۔ خدا اور قارئین گواہ ہیں کہ میں بھی احتراماً نہیں کہتا بلکہ محض تحیہ مخاطب کے طور پر!

شفیع عقیل نے کبھی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ جس کا واحد سبب وہ غربت اور صرف غربت قرار دیتے ہیں۔ لیکن بے اُستاد کے کبھی نہیں رہے۔ انہیں وہ استاد کامل ملا جو شاہد و تاجور

ایسی کسی کو خوبصورت ہوتا ہے۔ زمانے سے بہتر کوئی معلم اور استاد نہیں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جب آدمی نے جو کچھ پڑھا لکھا وہ سب ذہن سے محفوظ ہو جائے تو جو کچھ سچ رہے گا، اسے تعلیم کہتے ہیں یعنی اگوائف تھے ورکار۔ انہیں بچپن میں گئے ماموں نے انوار کر کے پگڑی۔ عرصے تک ان کی بھینچ بھرپوں جی آتے رہے۔ عدالت کے ذریعے ان کی بازاریابی عمل میں آئی۔ روپائی کے بعد انہوں نے کسی سے دو پیسہ ادعا لے کر میدانِ روضہ انجمنِ حسن پڑھے لکھے شخص سے اس پر چار اور بیسوا مٹا جانے تھے، اس نے خالی منوں کی تو انہوں نے کاروبار کر چھینک دیا اور "معم ارادہ" کیا کہ اب میں، جو کچھ کر دکھاؤں گا۔ جب کچھ ملے گا، ہونی تو سڑک پر پڑے روپائی اخباروں کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر پڑھتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ پیسے پیسے پڑھنے لگا، یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے اٹھتے چار پاؤں، ۱۹۴۷ء میں سڑکوں پر لاشیں پڑی ہوتی تھیں اور رنجوں سے گاجر مولیٰ کی طرح کٹی ہوئی لاشیں لگتی تھیں۔ انہوں نے نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو کر لاشیں اٹھائیں۔ دنوں کی پوریاں ڈھو ڈھو کر مہاجرین میں راجن تقسیم کیا۔ مدتوں کورے کے ڈھیروں میں ٹھین ڈبے یا تھیں قلع کرتے رہے۔ جلد مازی سیکھی۔ ایک دوست کی شہادت میں سائنس بورڈ پیٹ کرنے کی دکان اس جگہ کھولی جہاں آج کل لاہور کی وی اسٹیشن واقع ہے۔ مدتوں بوجھ ڈھوئے۔ سڑک کے کنارے چھا بڑی لگائی۔ ان کے والد راج مزدور تھے۔ بیٹے نے بھی ریت نہائی۔ مزدوری کی اور غربت میں پاؤں اور روضہ مند رہنے کا جہاں تسلسل ہنر سیکھا۔ ایکسٹرنل کا حلق بھی چھاپا۔ فرمانے ہیں کہ میں نے دھند سے سارے کیے ہیں۔ ناکام نہیں گزرا۔ ہر کام مجھ کے کیا۔ رنج کے کیا۔

۱۹۵۰ء میں کراچی آئے تو ادیب فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ رخصت سفر میں ایک رجنر تھا جس کے افسانے مجید لاہوری کو بہت پسند آئے۔ مئی ۱۹۵۰ء سے "جنگ" اخبار میں کام کرنے لگے۔ وفاداری پر شرط استواری کی زندہ و باندہ مثال ہیں۔ کیا ایسا ہو کہ مئی ۲۰۰۰ء میں "جنگ" اخبار اپنے اس دیرینہ خادم و محسن کی گولڈن جوبلی شاپان شان طریقے سے منائے۔ انہیں اس زمانے میں "جنگ" سے ساتھ روپے اور رسالہ "تک دان" سے بیسوا روپے ملتا تھے۔ ان کی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ اس رقم کو کیسے اور کس حد میں خرچ کریں! ایک جملی میں دیتے تھے۔ صدر

سے بھر لینی بخش کا لونی کا بس کا کرایہ پانچ سیسے تھا جو وہ فوراً نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ ابراہیم جنیس دھڑبھڑکاؤ نٹ اور دو تین دوست مل کر نیو جانی سے کا لونی تک گاتے بھاگتے پیدل جاتے۔ بعد کو ایک عکولی میں رہنے لگے۔ ایک رضائی تھی جسے گرمیوں میں بچھا لیتے اور سردیوں میں سب دوست اوڑھ کر سو جاتے تھے۔ ہوٹل والا چار آٹے ادھار پر کھا دیتا تھا۔ اقدار کو ادھار کی "ملف" بوجھا کر پھرتے کر دیتا تھا۔

شفیع عقیل ہر اعتبار سے غیر معمولی انسان ہیں۔ جس عمر میں ہم جیسے گندہ کاروں کو شادی کی خواہش رسوا شرمناک ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس عمر میں ان کو ساری عمر کو ادا کرنے کی بڑی شدت سے خواہش ہوئی جو آج بھی بدستور قائم ہے۔ ہماری جوانی میں انہوں نے کنواروں کا ایک کلب بنایا جس میں یہ شمول ان کے بگل تین بھر تھے۔ اپنی وادست میں یہ بڑکیوں کو رکھنے اور انہیں جس اڑنے کے لئے ایک کیڑا لٹا رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں ان کا پیچھا کریں گی، مگر ہوا یہ کہ پلٹ کر ان کے پیچھے نہ گئی۔ گویا جو چال انہوں نے بھلی پکڑنے کے لئے پیچھا کا تھا۔ اس میں آدم خور مگر چھ پھنس گیا۔ وہ بھروسے کے کنوارین کا خاندان خیر و خولی سامنے غلیٹ میں رہنے والی لڑکیوں کے عشق سے ہوا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس غلیٹ کے باقی ماندہ رومانی ادکانات پر توجہ نہیں فرمائی؟

ہولے میں دن بھر پنے کی بوریاں اور مردے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اتنا تھک جاتا تھا کہ کسی رنڈہ کو handle کرنے کے لائق نہیں رہتا تھا!

شفیع عقیل کو گھر میں کبھی بیوی کی کمی محسوس نہیں ہوئی، جس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کا بیش تر وقت اپنے گھر میں نہیں گزارتا۔ شادی کے خیال سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ مرزا عبد اللہ و دیگر مقابلہ زندگی یعنی ازاد دینی زندگی کو محبت یا مشقت سے تعبیر کرتے ہیں اور کمرستی جیون کو ہنسی گز رہی ایک شریفانہ بزدلانہ اور با کفایت شکل قرار دیتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا، اس زمانے میں کوئی عشق بھی کیا؟ فرمایا، کیوں نہیں؟ خود سے ڈیگھی عمر کی ایک سکھنی پر دل وہاں سے عاشق ہو گیا تھا۔ اسے قاتی بدایونی کے اشعار سناتا تھا، جن سے وہ

ایسی بد کی کہ ملنا ہی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی قاتی بدایونی کے دیوان کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اس باب میں ہم نے زیادہ کر دیا تو اپنے دیارے شباب کو ایک جھلے کے کونے میں بند کر دیا۔ فرمایا، "شاہ جی! میں نے ہر مزہ چکھا ہے۔" وہ کسر لڑی سے کام لیتے ہیں۔ مسلسل پچاس سال کے شغل اور ایک عمر کی بد پرہیزی کو اگر محض "چکھنا" کہتے ہیں تو ہماری تاحیات محرومی اور حسرت آوارگی کے لئے اردو و ششتری میں کوئی لفظ نہیں ملتا۔ ممکن ہے عربی میں ہو۔ عربی کا حوالہ میں نے اس لئے دیا کہ شاید ہے یک۔ زنیے یعنی ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے والے شوہر کو اب لکھیں، "دینی میں "مسکین" کہتے ہیں! واللہ مرزا کہتے ہیں کہ اماندہ بنا کے پیٹے ہیں اور نادان لہی کے منہ بناتے ہیں۔ ہمارے شاہ جی نے ہر کام "مجھ کر ادھر کو ادھر کو بن چا کے ہاتھ" کیا ہے! بچپن میں ہم نے درمی کتاب میں ایک شعر پڑھا تھا جو اس زمانے میں زبان زد جوان و نوجوان تھا:

سیر کر دنیا کی فاضل زندگی پھر کہاں
زندگانی مگر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

شاہ جی نے کرنے اور نہ کرنے کے کاموں کے لئے مناسب وقت اور موقع کا انتظار نہیں کیا۔ ادھر ملازمت سے قفل اتھریا ہر سال، کیا رو سینے کی جمع شدہ حسرت سیر و فکار نکالنے اور قارن و کسب کا سامانہ کو نہ ٹھکانے لگانے پر پ جاتے اور نت نئے مشاہدات و تجربات کی سوغات سے اندر سے پھلنے لگتے تھے۔ ان اشعار مرحوم یاد آتے ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے، نگڑیاں ضرور خرید کر لاتے تھے۔ دو تین کو کھا کر بچوں کی ملین خوش ہوئے اور سفر نامہ پڑھنے کی تلقین کرتے۔

شاہ جی تا دم آخر یہ کھنڈہ کنوارے ہیں۔ ان کی سدا سہا کن جوانی سے توقع نہیں کہ شادی کا تکلف کر کے خود کو خواہ مخواہ تکلیف میں مبتلا کریں گے۔ کنوارے ہیں۔ کنوارے ہی رہیں گے۔ لیکن کیسے کنوارے؟ ایسے ویسے؟ وقت کم ہے اور محفل میں خواہ مخواہ بھی موجود ہیں، لہذا صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اگر وہ عورت ہوتے تو کبھی کی "کار و کاری" ہو چکی ہوتی۔ یہ بات میں الزام یا بہتان طرازی کے طور پر نہیں کہہ رہا کہ وہ کاری کی خدمت مقصود ہے، بلکہ مذہبی رسم ہے۔ پسند نا پسند کا ذکر آیا تو کہنے لگے، "کتاب سے عشق ہے، بہت پڑھتا ہوں۔ مگر زندگی

میں کبھی کوئی کتاب دوبارہ نہیں پڑھی۔ افسانے نہیں پڑھتا، ناول سے بول آتا ہے، مان فکشن پڑھتا ہوں، جب تک زندہ ہوں، پڑھتا لکھتا رہوں گا۔

ادبی تقریروں اور جلسوں میں نہیں جاتے فرماتے ہیں: ”صرف اپنے فنانشن میں جاتا ہوں۔“ تاہم اس لئے کہ اس میں انھیں طوعاً و کرہاً تالی نہیں بنانی پڑتی۔

میں نے پوچھا: ”شاہجی، آپ کو ہالی کس رنگ کے پسند ہیں؟“ ”بولے: ”کسی بھی رنگ کے ہوں، میں تعصب نہیں کرتا، بس سفید نہ ہوں۔“

سوال: ”آپ کو کراچی میں رہتے بچپاس برس ہو گئے۔ اب آپ کو شہر زندہ دلاں لاہور کیسا لگتا ہے؟“

جواب: ”خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن جہاں جہاں بچپن میں مصیبتیں چلیں اور مشقیں اٹھائیں، جہاں چھابڑی لگائی، بوجھ ڈھوئے۔۔۔ وہ سب جگہیں مجھے پہچانتی ہیں۔ وہ رے اشارے کر کے بلاتی ہیں۔ لاہور میں اگر ایک گھنٹے بھی قیام کروں تو تین مقامات پر ضرور حاضری دیتا ہوں۔ داتا صاحب، میاں میر صاحب، اور شاہ حسین۔“

”آپ ان تین آستانوں پر ایک گھنٹے میں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”یہ بھی بزرگوں کا فیضان ہے۔“ انہوں نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے فرمایا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

سوال: ”آپ نے دنیا دیکھی ہے، سے خانہ نشینی سے ترقی کرتے کرتے خانہ نشینی پر اتر آئے ہیں۔ اپنی عمر کے کس حصے کو آپ بہترین دور گردانتے ہیں؟“

جواب: ”ااا ہالی پین والا زمانہ جب میں بچکی میں رہتا تھا۔“
یہ دہائی عازانہ اور متراف کا خزانہ شاہ حسین اور پلے شاہ کا شیدائی ہی کر سکتا ہے۔

انہوں نے کچھ لفظ نہیں کہا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں ساری عمر عیش کیا ہے۔ عاقب نے لفظ کے تمام ایک خط میں عیش کی جو تعریف کی ہے وہ اس باب میں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں: ”سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے۔“



اس مرد مجرد کے ایام جوانی کا قصہ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے جنسی انسانوں کا ایک سنگتاً برہمنیت مجموعہ شائع کیا، جس کا نام "بھوکے" تھا۔ فرماتے ہیں "نام بدل بدل کر ہر افسانے میں بھوکا میں ہی تھا۔" واضح ہو کہ بھوک دوسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو کھیتی کے نواسے اخلق سے اتارنے کے بعد مرمت جاتی ہے۔ دوسری زیادہ شدید بھوک وہ جو یہ نواسے مضام ہونے کے بعد غولن سارے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسان کی دوسری بھوک اور پہلی پیاس ہے۔ اس بھوک کی اشاعت پر پریز دنگ ۱۹۴۹ء، انٹرویٹ پاکستان فاشی کا فوج داری مقدمہ شریا تنظیم، بحسب سرٹ کی عدالت میں چلا۔ گواہان صفائی کی فہرست میں شورش کا نظیری، سعادت حسن منٹو، مولانا عبد المجید سالک اور دیگر بڑے ادیب تھے جن کو عدالت میں پیش کرنا شفیق قسطل کے بس کی بات نہ تھی۔ اکابرین کی یہ فہرست تو کہاوت والی مینڈکوں کی پیسیری ثابت ہوئی جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ مینڈک الفصاف کی ترازو سے پھدک پھدک کر نکل جاتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ عدالت نے چھ ماہ قید اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی۔

میں نے پوچھا، "آپ پہلے ادیب ہیں جسے عربی اور فارسی کے جرم میں چھ ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی۔ کیا آپ کے خیال میں آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی؟"

بولے، "نہیں۔ نا انسانی قطعاً نہیں ہوئی۔ وہ افسانے تھے بھی اسی لائق کہ منافق کو قسطل بھیج دیا جائے۔"

اڑتالیس سال گزارنے کے بعد اس مزاحیہ شادی کا واحد اعتراض یہ تھا کہ صرف تین مہینے کی ہوتی چاہئے تھے جو کسی بھی amateur اور کچھ تجربہ کار کے جوش جوانی کو احتیال پر لانے کے لئے کافی ہوتی۔

جوانی کے سارے کام انہوں نے نو جوانی میں ہی شائد یہ بوسہ لیا تھا تا باقی رو گئے انہیں بھری کی پٹنہ کاری کے لئے اٹھا رکھا۔ کچھ بے وقت سے پہلے جوان ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ مین جوانی میں بڑھاپے کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ عمر رواں کا شدید احساس انہیں تنگ جوتے کی طرح ہر وقت کا شمار ہوتا ہے۔ ہم بعض ایسے شاعروں سے واقف ہیں جو مدت العمر سے شدت العمر میں مبتلا ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جن کی ایام جوانی کی شاعری میں دم کا پیلو جھلکتا ہے اور عہد بچی کے

اشعار سے زم زم جھلکتا ہے! لیکن کچھ شاعر اور ادیب ایسے ہو گئے ہیں جن کے لفظ کی امر جوانی پر بڑھاپے کے سامنے کبھی نہیں پڑے۔ گردش بیل و ہمارا ان کا کچھ نہ بکا تو سکی۔ چشم تصور دنیا میں اور حافظہ شیرازی کو بڑھاپے کے روپ میں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس کا اطلاق ممتاز مفتی اور نصیر جعفری کے سدا بہار قلم پر بھی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شفیق قسطل کی تحریر بھی کھرتی، اعلیٰ اور رسورٹی جاتی ہے۔ موقع محل و محلہ کرنا کنگلی لینے اور اٹھانے کو کبھی کم نہیں سمجھتی۔

پنجابی لوگ کہانوں اور پنجابی کے قدیم شعراء کے ترانے جس نغم اور لہج سے شفیق قسطل کم و بیش ربع صدی سے کرتے رہے ہیں، وہ دونوں زبانوں سے ان کی شیطانی اور عہد و ناک کی استواری کا ثبوت ہیں۔ ان کے معنوم ترجموں کی نظر پار (see through) چلن سے معن کا اصل حسن انکار سے مارتا ہے۔ ترجمے کی دشواریاں کچھ ترجمہ ی جانتے ہیں۔ اپنی زبان میں کسی دوسرے کا مدعا کسی تیسرے شخص کو سمجھانا قلم جو حکم کا کام ہے۔ اس کا نتیجہ ہر اہم و ہر بے تیرے قفل کی صورت میں ضرور ہوتا ہے۔ کچھ ترجمہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اصل سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں جیسے فخر جہر اللہ کا رباعیات خیام کا انگریزی ترجمہ۔ ناگوار تا طر نہ ہو تو عرض کروں کہ مجھے نو انگریزی ترجمہ اصل سے بہت بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے ہماری نہیں آتی۔

اس کے برعکس بعض ادیب (طبع زاو) تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جن میں ترجمے کی شان پائی جاتی ہے۔ جیسے محمد وی و عمر بنی جناب عبدالعزیز خالد کا کام۔ جب تک آدمی فاضل اصل اور عالم بے بدل نہ ہو۔ اور جب تک چار پانچ زبانوں میں مہارت نہ نہ رکھتا ہو۔ یہ پنجابی اور دہلیا ب خاص خصوصیت کا کام ہیں۔ یاد نہیں ہوتی۔ ایسے ترجمے کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ جب تک اس کا بھی مزہ ترجمہ نہ کیا جائے، اصل زبانی واضح نہیں ہوتی۔ تفہیم برحرف، جب تک ہماری طرح آپ کو بھی چار پانچ زبانوں سے گہری واقفیت نہ ہو تو آپ ان کے کام کی دان نہیں دے سکتے۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ شعر ہی معلوم ہو، اس پر ہماری نثر کا گمان نہ ہو۔ جب کہ ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ جناب شان الحق حق نے انٹونی اینڈ کلو پیر کا دلی کی پامبار و زبان میں جو رواں دواں اور مختار دے دار ترجمہ کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ ایک شاہکار سے کم نہیں بلکہ بعض مساب

اگر اے احباب کا خیال ہے کہ شیکسپیر کے متن سے بہتر ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا، ہم اس عہد کے سب سے بڑے زبان دان سے اسلحاں لیتے رہے ہیں اور انھیں اپنا استاد و مرشد جانتے ہیں۔ جلد اگر ہم یہ کہیں گے کہ ان کا ترجمہ اصل سے بہتر ہے تو امید ہے کہ ہمارے بے پرواہ اسے شاگردانہ خوشامد (نئے پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی بی عمیق مصداقہ کہتے ہیں) تصور کریں گے۔ لیکن انتظام ضرور کیجئے گے کہ شیکسپیر اثر اردو میں لکھتا تو ہلکے دس میں لاکھ دو سو تارے ہمارے استاد سے بہتر نہیں لکھ سکتے تھا بلکہ ہماری طرح اصلاح لینے کے بعد بھی اپنا گستاخ سفید فام زانوئے نکلندہ کیے جیسا رہنا۔ تاکہ زانوں میں ہو جائے اور وہ قلعہ ہوئے کے لئے اٹھنے کے لائق بھی نہ رہتا۔

مشہوری ”سینٹ ایلووک“ کے مسودہ اور منتخانہ مقدمہ سے اس جگر کاری اور عرق ریزی کا اعزاز ہوتا ہے، یومین کی محنت، تدوین اور تخلیق میں کی خاطر گوارا کی گئی۔ کوئی ماخذ ایسا نظر نہیں آتا جسے انہوں نے کھٹکا نہ ہو۔ رواں اور بھلے تر سے میں انھوں نے کہیں بھی لفظ کو لفظ پر قربان نہیں کیا۔ تحقیق و تدقیق ہمارا میدان نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی چھوٹے یا بڑے میدان سے ہمارا واسطہ نہیں رہا۔ ہم تو ان میں سے ہیں جن کی دریاہنگی شوق ایک چھوٹی سی پناہ تراش کر آسودہ ہو جاتی ہے۔ ساری زندگی اعداد و شمار اور کتنی سے سرکار اور شغف رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے گن کر دیکھ تو معلوم ہوا کہ مقدمہ سے میں اے سین کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ تعینات و واقعات کی صحت اور تصحیح نہائی کے ضمن میں انھوں نے کتنی اور کبھی محنت کی ہوگی؟ انہوں نے یہ کمال صحت و لفظ ترجمہ کیا ہے اور جو کردار تحقیق و تدقیق میں ہے۔ انہوں نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو مستقبل میں ایک معتبر حوالہ اور سند کا درجہ پائے گا۔

میاں محمد بخش کی مشہور تحفہ کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے، جو ہمارے ہندوستانی اور نئے کارگران قدر حصہ ہے۔ یہ ایک شیرازہ کی داستان ہے جو لوک لہجے میں بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے ”سینٹ ایلووک“ کو کلام ایلووک تو نہیں کہیں گے لیکن اس کے ملک الکلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ پنجابی شعروادب اور لوک کہانوں کی اشاعت و دونوں زبانوں کی تحفہ و ترویج کے عمل کو تیز کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ مستقبل کی اردو کا لب و لہجہ، رنگ و بھر اور روزمرہ و ہی ہوگا جو اس کے بولنے اور برتنے والوں کا ہوگا۔ پاکستانی زبانوں کے کلاسیکی ادب کے تراجم، اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں

کو اساطیری تعلیمات، تصویروں پرانی لوک، روایات، امثال اور imagery کے نو دریافت خزانوں سے روشناس کرائیں گے۔ اردو ان صحت مند تاحاتی اضافوں کو خوش دلی اور شہدہ جنتی کے ساتھ جڑو زبان بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، وراثت میں اس کا ساتھیاتی ارتقا اس کی فطری چلب اور انجہانی اور ایجابی صلاحیتوں کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ کسی وسیعہ و دیوار پر قدیم آرائشی اثاثوں لگانے کا عمل نہیں بلکہ ایک چلب وراثت پر دوسری جہری ترقیاتی جاتی شای کی قلم لگانے کی ابتداء ہے جو دونوں کی مٹا اور پھولنے پھٹنے کی ضمانت ہے۔

خدا کے قیام ان ہاتھوں، طاعت باکرست رکھے جو اس تحریک رنگ و چہار رس کے سد بہار شہری آجادی میں دل و جاں سے مستہک ہیں۔

ایک ذریعہ صحافی کی ختم نم سے شہری، جس نے پچاس برسوں میں کوئی تین حکومتوں کو دھوم دھڑکے سے جیتے، بدھکین مارتے اور سپاہی سے رخصت ہوتے دیکھا ہے۔ ہیف درجہ زدن شہر سے آخر شد۔ اور ایک اسی پر موقوف نہیں ساری قوم جاتی آنکھ سے خواب و بختی اور سونی آنکھ سے حالات حاضرہ کا مشاہدہ کرتی رہی ہے۔ مرزا عبدالودود یک خانی کا سوا سو سال پرانا مکر حسب حال شعر دوسرے مصرعے سے صرف کے ساتھ اکثر پڑھتے ہیں:

آنکھ سب ایک کھلی دیکھتے ہیں اور ایک مندی

اس میں سندی ہیں، مہار جی ہیں، پنجابی بھی

جب دو آنکھیں زائد از ضرورت معلوم ہونے لگیں اور ایک آنکھ سے دیکھنے کی عادت پڑ جائے تو تسلیم و رضا کا شیوہ اتنا چلتا اور ایمان اتنا مشہور ہو جاتا ہے کہ لائق لائق بھی من جانب اللہ معلوم ہوتی ہے۔

صحافت اور ”جنگ“ سے ان کی پیشہ وارانہ اور جذباتی وابستگی ہے، پچاس بہار میں دیکھی ہیں: یہ نصف صدی کا قلم ہے، دو چار برس کی بات نہیں

جو کام بھی انہیں تقو بعض ہوا یا صحافت اور تصنیف و تالیف کا جو شعبہ یا عنوان انھوں نے اپنے لیے تجویز کیا، اس کی بجا آوری اور تکمیل میں اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔ ان کی لگن، تن ویدی اور جگر کاری کا ثبوت کیجیں کتابوں کے علاوہ وہ بکھرے ہوئے مضامین بھی ہیں جو کتابی فطرت

پس نوشت

اس مضمون کے چیدہ چیدہ حصے بطور اخباری مصلحت، شیعہ قتل صاحب کی تین کتابوں کی تقریباً ابراہیم بن محمد کے چند روز بعد و غریب خانے پر تحریف لائے اور اسے بہت وسعت کی، جسے غلط جانی کہتے ہیں ان کی شائستگی مانگتی تھی نشان دہی کی۔ ایک پرچہ میرے حوالے آیا جس پر چار قابل اصلاح و نا قابل روزگار غلطیوں کی وضاحت کی تھی جو ان کے غلط فہمیوں میں تھیں۔
 اے آپ نے لکھا ہے کہ میں افسانے نہیں پڑھتا جب کہ میں نے کہا تھا میں آج کل افسانے نہیں پڑھتا۔

یہ باتی بڑا یاد رکھ فرق ہے مثلاً کوئی ملزم یہ کہے کہ میں نے پیش کیا تھا کہ "میرے قتل نہیں کرتا" بلکہ یہ کہا تھا کہ "میں آج کل قتل نہیں کرتا" تو عدالت اسے بری کرنے سے پہلے دس دھڑ سوچے گی۔

۲۔ تجھ سے مجھزگر زندہ ہیں

جان بہت شرمندہ ہیں

"آپ نے یہ شعر افتخار عارف کے حوالے سے لکھا ہے، یہ بیاد اللہ علیہ السلام کا ہے۔"

عرض ہے کہ یہ شعر افتخار صاحب کے پہلے مجموعے "میر و نغم" میں موجود ہے۔ وہ بہت جگہ اور آیات وارد آئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے دلوں میں شامل کرنے سے پہلے انہوں نے پوری طرح غور کیا ہوگا کہ یہ شعر انہیں کا ہے۔

جب یہ کتاب چھپ رہی تھی تو میں نے لندن میں افتخار صاحب سے کہا تھا کہ اگر یہ شعر حذف کر دو۔ اس لئے کہ ہمارے ذہن و شواہد چرے پر مجھے شرمندگی کی کوئی دقت نظر نہیں آتی بلکہ تازہ فتوحات کی علامات ہو رہی ہیں۔ مزید برآں، شخص زندہ ہے جانے پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو ان آدمی کے لئے شرمندہ ہو۔ نے کا کوئی ماحول تھا اور ضروری ہے۔

چہاں یہ ہیں۔ بولے بلا وجہ شرمندہ بھرنے سے دوسروں کی ناکئی تسکین ہوتی ہے۔

۳۔ کڑکیوں میں کھڑی ہونے والی لڑکیوں اور کنوارا کھب کے واقعات گنڈہ ہو گئے

میں شائع نہیں ہوئے۔ ان کے ذاتی خزینے میں تار و تار کھنڈ اور ان پر وہ مضامین بھی شامل ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔ انہوں نے صحافت کی چاروں رخ کے سارے تقییب و فراز دیکھے ہیں۔ فراز کم، تقییب زیادہ۔ اور اس سے بھی بدتر، خود دے ظہیری کا چھٹیل اور بے برگ و بار پلیٹوں، انہوں نے نظر علی خاں، چراغ حسن حسرت اور عبدالحمید سالک کا آخری دور دیکھا۔ ڈھلتے سورج کی تابش دیکھنا کی کو جذب کیا۔ پھر یہ بھی دوراں نے وہ دن بھی دکھائے جب صحافت میں جب جاہ و زر کی قلم لگائی تھی جسے عرف عام میں "گلفاؤڈرلزم" کہتے ہیں۔ شاہ جی اس گلشن پر خار سے خود کو دکھائے بغیر بے نیازانہ گزر گئے۔ سیاست کی کشمکش اور Polarization کی تحریف و تشویش سے کینے صوفی اور کالم نویس ہیں جو خود کو بچا سکتے ہیں ان حالات میں حکومتیں اگر Fourth Estate کو اپنا زرخیز ترہان و تاج فرماں بنانا چاہیں تو تھج نہیں ہونا چاہیے۔ صحافی ہو یا سیاست دان، سچ ہو یا جھوٹ اور بیور و کریمٹ۔ یہ سب اسی ترکیب سے "کڑائی" دیتے ہیں۔ جس طرح بعض ملائقوں میں بندر بکڑا سے جاتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ریل میں اتارنا سورخ بنادیا جاتا ہے کہ صرف بندر کا پتہ اندازہ جاسکے۔ بندر نرم و شیریں کھوپرے کے لالچ میں اس میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور محلی میں بہت سا کھوپرا بھر لیتا ہے۔ لیکن بھری محلی کو تک سورخ سے نہیں نکال پاتا۔ محلی کھول کر کھوپرا چھوڑنے اور ہاتھ چھڑانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا اسی طرح ایک ہاتھ ریل میں پھنسا کے تین پایہ پائلنگز اس پر جرتا ہے اور آسانی سے پکڑا جاتا ہے۔ پھر ساری عمر مداری کی ڈکڈکی اور اشاروں پر قریہ قریہ نقلی اچھل کود کر دکھاتا ہے اور ہاتھ پھینکا کر پیسے بخود دے۔ مداری اگر دھککا کر اسے جنگل میں آزاد چھوڑ بھی دے تو واپس آ جاتا۔ بھار کی سنے مداری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔

سو بچی حال ان حضرات کا ہوتا ہے جن کے معزز پیشوں کے نام بھی اب پر گزائے گئے ہیں۔ صحافیوں کی خصوصیت نہیں۔ اس خاتہ بندہ و انداز است۔ پھر بدگمانی اور شک و شبہ سے مملو ایسی فتنا پیدا ہو جاتی۔ جہ جس میں اگر کوئی شخص عالیہ بادش یا نیکل سے غریبوں کی بھی تحریف کرے تو اسے حکومت کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں تو بے تقریری اتنی بڑھ گئی کہ حکومت نے صحافیوں کو بے اثر و بے ضرر جان کر انہیں پکڑنا ہی چھوڑ دیا جس سے ان کی بڑی ٹپنی ہوئی۔

ہیں۔ لڑکیوں کا قصہ ۱۹۶۶ء کا ہے اور لاہور میں دکان کے حوالے سے ہے۔ جب کہ کنوارا کلب ہم نے ۱۹۵۴ء میں کراچی میں بنائی تھی۔“

مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں نے لاپرواہی سے لغت آوارگی کو نحو سجدہ تجرّد سے خط ملط کر دیا۔

ان کی وساحت سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی آزاد روی اور آوارگی کے بیان میں بھی وہ عظیم قد و ادا و استقامت و فیہر کی محنت کا انسانی خیال رکھتے ہیں جتنا کہ مرحوم شاعروں کی زندگی پر شک و شبہ کے دوران حجازان پبلک سے کام لیتے ہیں۔

اس القوس کا اعتراف لازم ہے۔ مرزا عہدِ نوروزیگ نے کبھی نہیں دانا کہ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ چرواہوں اور قصباتوں کی Snobbery میں بڑا فرق ہے۔ بیچو بکری کا گوشت بیچنے والا قصباتی گائے بھینس کا گوشت بیچنے والے قصباتی سے برتر اور زیادہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس گائے بھینس برائے والا چرواہا، بیچو بکری چرانے والے گھراے پر فوقیت رکھتا ہے۔

ہمیں امر کا علم نہیں تھا۔ اس لئے کہ ہمیں تو بچپن میں صرف مرغیاں چکاتے اور انھیں بھال کر رہے ہیں بند کرنے کا تجربہ ہے۔ اللہ جانے اس وجہ بندی میں ہمیں کس طرح پیچھا کر لیا جائے گا۔ مرزا نے یہ بھی کہا کہ قلم نے لکھا ہے کہ ”میں (یعنی شاہجی) بکریاں چراتا رہا۔“ جب یہ مضمون نیچو او تو ازاد کرم پر امریکا کی صحیح زیر ضرور گھونٹا، ابھی قلم سے۔ یہ اس لئے امریکی ضروری ہے کہ آگے جل کر قلم نے لکھا ہے کہ شاہجی کو بچہ ہادی مرزا نے قید ہوئی۔ جس طرح بعض لکھنے والے واقعات کو ضابطہ ملکہ کر دیتے ہیں، اسی طرح کچھ بچے والے اعراب اچھر کے اوپر کر دیتے ہیں۔ ذریعہ کی جگہ پر درود زری کی جگہ سے پیش نکادے ہیں ا

خطبه

جناب صدر محترم! کہیں پورے آف گورنرز عزیزان! گرامی، معزز خواتین و حضرات! آپ نے مجھ جیسے شخص کو جو ایک مدت سے الٹی اسٹاک فٹ میں ہے، اس تقریب سعید میں دعوت کا کام دے کر میری توقیر بدھائی ہے۔ یہ دل سے سپاس گزاردیوں۔ سچ تو یہ ہے کہ سمرت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ میری حیرت اور اندیشہ ہائے دور دورہ! آپ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر جناب شاہد عزیز! صدر مہدی نے ایک بے ساختہ جملے سے دور کر دیا۔ فرمایا کہ ہم کبھی کسی صاحب اقتدار یا وزیر یا تاجر یا معزز سرکاری افسرین پر تقریر کو زحمت کلام نہیں دیتے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو اپنے گہرے زکے تاخیری مرحلے میں، جس کا گراف دل کے مریض کا ECG معلوم ہوتا تھا، ہر کار، بے پرو کار کا افسر ناچار بھی روچکا ہوں۔ انہوں نے یہ کہہ کر میرے جاتے دوڑ کر نا چاہا کہ جو افسر بیٹا ہو گئے یا دوسرا کر دیے گئے، ان کا شمار ہم اعلیٰ افسروں میں نہیں کرتے! اس وضاحت کے بعد اس عزت افزائی کا سبب کچھ بگڑا، ہماری کچھ میں بھی آنے لگا۔

حضرات! آج کل بیوروکریٹس اور مشنریزوں بھی بہت بدنام ہیں لیکن ان سے بھی بدتر ایک اور کلاس ہے، وہ ہے، جاننا کہ بیوروکریٹس اور مشنریز کی راورٹی یہ کس سے ہے اس کا ذکر میں نہیں کرتا۔ ہمارے مذہم پر یہ منبرِ راعیہ الودود جب تو ایک اور عہد کا ہے جہاں وہ کہتے ہیں کہ بیوروکریٹس کے املاک کرینٹ کی پے کے نیچے دے کے جہاں سے عین نفلہ لگا دیے جائیں تو املاکِ عطلی دور ہو جائے گی لیکن انھیں یہ خیال نہ آیا کہ ہمارا دل ششہنی کی صورت بھی پیرا ہو جائے گی۔ زیادہ عرصہ

۱۶۔ چوتھوں نمبر، ملی سکول آف آرٹس انڈیا کے پندرہ تقسیم شدہ کے مواقع پر (۳۰ ستمبر ۲۰۰۹ء کو پڑھایا)

نہیں ہوا مجھے زیورہ گری کے کڑھ اسلام آباد میں۔ مگر غول بادشاہ گرام کی کلام کر دوشوں سے دور نیک طے کی صداقت کا شرف حاصل ہوا جس میں وزیر داخلہ اور سیکرٹری پروٹوکول بھی روئی افروز تھے۔ میں نے تمہیں اعرض کیا کہ اس سیاسی داراؤں خراب میں آنے میں مجھے کافی جمل ہوتا ہے۔

مجہ یہ کہ اسلام آباد دور حقیقت جنت کا نمونہ ہے۔ جنت کا نمونہ اس اعتبار سے کہ یہاں جو بھی آتا ہے، حضرت آدم کی طرح نکلا جاتا ہے۔

میرا خیال تھا اور یہ کہ مجھے اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر میں کسی مشق یا فلاحی کی بنا پر دعوت کلام دی گئی ہے۔ مگر نہ کہاں میں کہاں یہ کلام اللہ اللہ! مجھ سے اس نے ابھی اشارہ عرض کیا، میرا دل دیکھئے اور قدر و منزلت پر جانے کے لئے اس سے زیادہ اور کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ:

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوگا!

آرٹ میں اپنے دوک اور مدرس کے ہارے میں چند ذاتی کز ارشاد آئے فائنل میں ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ غالب طلوع اور خوردوں کے سامنے بھوت ہل کر دوش کوئی کا دستہ، بڑی شہوت فراہم نہیں کرنا چاہتا۔ چوٹی جماعت میں چار دن فارسی پڑھنے کے بعد میں آہ آہ ہی، آہ آہ آہ اور شد، شدی، شدیم، شدو اور شدو کی گردان سے ایسا وحشت زدہ ہوا کہ آنکھ بند کر کے دارانک لے لی اور آگے چل کر ثابت ہوا کہ سڑک تک دارانک کے دوران بھی بندھی رہی۔ فارسی سے قریب قریب ناچلے ہونے کے باوجود میں کیسی اردو لکھتا ہوں، اس کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے کہ شادی کی ایک تقریب میں کراچی گریمر اسکول کے ایک لڑکے نے پوچھا: ”اغل! کیا آپ کو آسان اردو لکھنے میں بہت دقت ہوتی ہے؟“ میں نے کہا: ”میرا غورہ، یہ خیال کیسے آجائے؟“ ”آپ کی وجہ سے گریمر اسکول کے لڑکے اردو میں قس ہوتے ہیں“ ”لڑکوں کے چائے کے وقت میں غریبان آرٹ اسکول میں مجھ سے یہی کہہ چب وال نہ کر تھیں۔“ غصہ ہوئی کہ میں نے فارسی صرف چار دن پڑھی۔ اگر تین چار دن اور پڑھ لیتا تو مجھے یقین ہے کہ کراچی گریمر اسکول کے لڑکے برسوں اور (O) کیل میں قناریاں نکالتے اور مجھے گریزی میں کہتے رہتے۔

خیر، یہ تو گریمر اسکول پر شامہ بہتر خدمت۔ جنت آرٹ اور دارانک کی بوری تھی۔ عزیزو!

آج میں جماعت تک تو جیسے جیسے گزر ہوئی۔ کیونکہ میں گھر اور انور کا ٹوٹا ہوا سا بلیا لیتا تھا جس میں دو سو کلاس میں کچھ کرپہ واضح ہو گیا کہ میری تمام تر آرٹسک مہارتیں اور صلاحیتیں گھرے اور انوروں کے گچھے پر ٹھم ہو گئیں۔ بندہ دارانک ماسٹر کہتا تھا کہ تمہارا گھر کا گندہ تو پھر بھی پہچان لیا جاتا ہے، اس لئے کہ تم اس کے پیچھے ٹوہ دور تر حروف میں لکھو اپنے ہو کہ یہ گھر ابہا لیکن اگر کوئی کنواری کنیا جی دو ڈیز دینے والی گھر۔ یہ کوسر پر رکھ کے پگھلت پانی پھر نے جانے تو میں نے پلے لوہ سے آدھے رستے میں بیٹھیں سے گھرے کو پھر کر دیں کے اور گوری وین کھڑی کھانگت کے پتے کھول کے سسٹرائے گی۔

بھلا ہوا مری ٹکری ٹوٹی
چٹا بھرن سے تھوٹی

دارانک پچھلے برس کھا کر یہ مشورہ دیا کہ تم اتوار کو میرے گھر آکر دارانک کی مشق کیا کرو، دو تین اور غری لڑکے بھی آتے ہیں۔ جتنا پچھلے پابندی سے وہاں بھی چٹائی پر ڈالو تو تمہارے گھر نے لگا۔ ڈیڑھ سال کی شاگردی کے بعد میں کس درجہ کمال پر پہنچا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دن استاد نے اپنی ایک اور فکر تصویر جس میں کرشن جی ہنس رہے تھے۔ مجھے دی اور کہا ”اسے“ ”کافی“ ”کرو۔“ تین گھنٹے کی محنت، شائق کے بعد جو تصویر میں نے بنائی، اسے دیکھ کر استاد نے کیا کہ اس میں صرف ہنس رہی تھیک بنائی ہے ان دنوں امتحان میں lettering کے دس نمبر علامہ ہوتے تھے۔ سوچو، وہ فوٹو خطی کے پیش دس میں سے دس نمبر حاصل کئے۔ اسکول اور کالج سے نکلنے کے بعد لڑکی نے جتنے بھی نئے سے سوال کئے۔ ان کے جواب ہم نے ہمیشہ غلطی دیے۔ لیکن خوش خطی کے بارے میں حاصل کئے۔ عزیزو! کامیابی، ناکامی، فتح و شکست اور کامرانی و بامراری تو فوٹو نقد پر کے علاوہ اور بھی بہت سے عوامل اور اتفاقات پر منحصر ہے۔ لیکن زندگی کو خوش سلیقگی، خوش نظری اور خوش ولی سے گزرا لے جاتا اور نازدار ترقی سے اپنی کاکہ کے لیے خوش گزرا اس نفع دہاں اور رخصت کنال گزرا تاہر ایک کے اعتبار میں ہے۔ نکلا کا کام ہے دنیا کی کوئی طاقت نہیں جیت سکتی۔

بات گھر سے شروع ہوئی تھی گھر سے پر ہی ٹھم کرنا چاہوں گا۔ آزادی سے پہلے میں

راہنما تھا ان میں سے پورے ایک خلع شہزادوں میں ذہنی کمزور تھا۔ ایک دن میں دور سے پر قبضہ اور سے پورا وادائی پہنچا جو راجپوت خاندانوں کی ایک جنگ جوستان بھومیا کا گڑھ تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ جیسے گڑے میں زمانہ طالب علمی میں کاغذ پر بناتا تھا۔ بالکل ویسے ہی گڑے قصبے سے ذرا دور پر ایک دکان میں بچے ہیں۔ شگلا لہوڑے اور چارٹ اوپے تھے۔ عام گڑوں کی دکانیں کھار وائے میں تھیں۔ سرشت دار نے بتایا کہ بھومیا راجپوت بہت بڑی، فہور اور سفاک ہوتے ہیں۔ کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو وہ اسے ایسے ہی گڑے میں بند کر کے زندہ دفن کر دیتا ہے۔ مجھے ان گڑوں سے نفرت کا ایک اور جواز مل گیا۔ حال ہی میں، میں نے چند خواتین آرٹسٹوں کی روٹنی تصویریں دیکھیں جن کا مرکزی موضوع عورت کی محرومیت، استحصال، ذہنی حالی اور مظلومیت کی مختلف صورتیں اور دردناک پہلو تھے۔ تین تصویریں گیمبر رنگوں میں کاروکاری پر بھی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے وہ خوبی گڑے سے طرح پر آئے جنہیں میں زمانہ طالب علمی میں ان جانے میں بنایا کرتا تھا اور جو اب میرے لئے صرف عورت کی ازلی مظلومیت کا سبب بن کر رہ گئے ہیں۔

شاہد عزیز صدیقی صاحب نے گزشتہ تینے ازراہ کرم مجھے اسکول کے مختلف شعبوں کے فائنل سال کے طلبہ و طالبات کے شاہکار دکھائے تو میری نگاہیں اپنے مخصوص گڑے اور کئے انگوڑا ش کرتی رہیں۔ کیسے بتاؤں کہ انھیں نہ پا کر مجھے کتنی خوش ہوئی۔ نئی ذہنی نسل اب ان گڑ گڑوں اور کئے انگوڑوں کی منزل کو پہنچے، بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ اسکول کے نو جوان آرٹسٹوں کی فکر و نظر کی انفرادیت، تازہ کاری، ذکاوت اور جدت رنگوں اور خطوط میں جھلکتی ہے۔ بدشگاہی ہی موقوف نہیں۔ کیونکہ کیشیز اور مجسمہ سازی کے نمونوں میں بھی چونکا سہاٹی شعور اور جہاں تہاں غیر نیم اور تند و تیز Statement جیسی کلمے مدعا نظر آتا ہے جو چونکا دیتا ہے۔ ایک دور قدغن ایسا بھی گزرا ہے۔ جب آرٹ میں ایسے الاعا و بلاغ پر بعض بزرگ ناک جھوں ہی نہیں ماستیش بھی چڑھ جاتے تھے لیکن آرٹ اپنی تمام تر شعور و توانائی زندگی اور اس کے مظاہر و مسائل سے حاصل کرتا ہے۔ آرٹ مٹی پلائی کی مانند نہیں ہوتا جو بغیر زمین، بغیر کھاد، بغیر سچ، بغیر جڑ اور بغیر دیکھ کر کچے کے خوب بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ فن کار رزم شیر و شر میں خاموش تماشا کی حیثیت سے ایک

مخلوط فاصلے پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ دانستہ کہتا ہے کہ جنم کا گرم ترین طبق ان لوگوں کے لئے مخصوص ہوگا جو مرکزہ خلق و باطن میں ٹھہر جانے والے ہیں۔

میں ہلک کر کہاں سے یہاں آگیا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اپنی گفتگو کا آغاز اس خوش خبری کے ساتھ کروں گا کہ خواہ میری باتیں بے راپا اور اکڑی اکڑی معلوم ہوں لیکن حبیہ و موعلت اور پند و نصیحت سے بہر صورت خود کو باز رکھوں گا۔ حقیقت جلد حری کا شعر ہے۔

ہیں یاد مجھے آج بھی ایام جوانی

میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

اتنی وضاحت کرتا چلوں کہ نقش جوانی میں بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے بلکہ معتبر دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اب بہتر لگتا ہے!

میں نے زندگی میں ایک ہی کنوینشن ایڈریس بدرجہ مجبوری اپنی گریجویشن کی تقریب میں سنا ہے۔ اس کان اور تاریخ اس لئے نہیں بتاؤں کہ اسے بتاتے ہی آپ میری تقریر سننے کے بجائے میری عمر کا حساب لگانے میں الجھ جائیں گے۔ میں آپ کو بھری مکمل میں منٹل آرٹسٹک کے مذاہب میں جتنا نہیں کرنا چاہتا۔ تو عرض یہ کرنے چاہتا تھا کہ اس ایڈریس میں حسب معمول اتنی اور ایسی نصیحتیں کی گئی تھیں کہ اگر ہم واقعی ان پر عمل کرتے تو کہیں کے اور کسی کام کے نہ رہتے۔ مطلب یہ کہ صرف دوسروں کو نصیحت کرنے کے لائق رہ جاتے اور لوگ ہماری زندہ مثال سے عبرت پکارتے۔ یہ سچ ہے کہ اپنی پیشہ ورانہ اور پیرائہ خواری میں شاہرہ خوبی تقدیر کے علاوہ کچھ ہماری نیم رضا کو بھی دھل جاتا۔

سچ شہر دے لوک وی ظالم سن

سچ مینوں مرن دا شوق وی سی

اس دن ہمیں دنیا سے نفی آجوب زندگی اور آنے والے دنوں سے اتکا ڈرایا گیا تھا کہ مستقبل کی دہشت دل میں ایسی بٹھکی کہ آج بھی کبھی بے تحاشا نہ چاہتا ہے کہ حال اور مستقبل کو جتنا جتنا کے بقیدہ عمر عزیز ماضی اور ذکر ماضی میں گزرا دیں۔

کسی دانا کا قول ہے (یہاں اشارہ اپنی ہی طرف نہیں ہے) کہ انسان کے حق میں یہ کہیں

بہتر اور بڑھتے ہوئے وقت اس کی برسی کا ہوتا۔ پھر بتدریج ستر، ساٹھ، پچاس سے کم ہوتے ہوئے منہ منہ جتنی لیے جہاں کافی سے رخصت ہوتا، سا سو کیسے مرنے کی ہوتی وہ زندگی جس میں انسان بوڑھے سے جوان، جوان، جوان سے نو جوان اور نو جوان سے معصوم بچہ ہوتا چلا جاتا!

تعمیموں، تنبیہوں اور ڈراووں سے لبریز وہ کنونشن ایڈریس من کر میں نے وہیں توبہ کر لیا کہ زندگی میں اب دوبارہ کوئی کنونشن ایڈریس نہیں سنوں گا۔ چنانچہ ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لینے تک سیم اسٹو کے جلسے میں نہیں گیا۔ میرے سالن کمان میں نہیں تھا کہ ایک دن، یعنی آج کے دن مجھے ملے ایڈریسائی کا یہ دلہن خوش کوادریس تمام دینا چاہے گا۔ میں خوش کروں گا کہ بزرگانہ ہند و نصیحت اور آپ کی باتوں کی اصلاح کا کوئی پانچ سال منصوبہ، معرض گفتگو میں نہ آنے والی لیکن اگر بے دھیانی میں کوئی کلمہ خیر یا اسلامی فقرہ زبان پر آجائے تو اسے انسانی کمزوری سمجھ کر معاف کر دیتے گا۔ ہندو شریہ خواہ بلکہ بالخصوص بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔

صاحبو! سنگے ٹوٹوں کے لوگ، جن میں اپنا شمار کرتے ہوئے کچھ نہ کوآتا ہے۔ درحقیقت خود کا قتل اصلاح ہوتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کا تعلق کاروباری پیشوں سے ہے یا فن اور شعر و ادب کے میدان سے، ان کے ساتھ نہ کہ کوئی نئی نسل کے لئے مشکل نہ ہوتا چاہا ہے۔ کوئی سو برس قبل اکبرؒ آیا دیئے کیسے پتہ کی بات کہی تھی:

یوزمیں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں

لیکن نہ موت آئے تو یوزمیں بھی کیا کریں

کچھ لوگ اپنے اندر قہر طرز بود و باش اور آداب و اقدار کی صحت و صداقت پر اس درجہ یقین رکھتے ہیں کہ اس سے سر مو اختلاف باقی جدت اور فکری اجتناب کو قرب قیامت کی نشانی تصور کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل ان کی کج گلائی کے سامنے ہی طرح اپنا قبلا در است کرے جس طرح انھوں نے اپنی جڑوں نسل کے سامنے کیا تھا۔ اگر وہ سلام کا جواب اس طرح دیں جیسے سلامی سدا ہے۔ یہ ہوں تو یہ ان کی عادات و راسخ کے علاوہ ان کا روایتی حق بھی بنتا ہے۔ میری عمر اور نسل کے لوگ عرصہ دراز سے ”علیم السلام“ ہی کہتے آئے ہیں۔ اسکا ہی شان اور طےنے والے ایک بزرگ

کے بارے میں سنا ہے کہ جب وہ قبرستان میں داخل ہوتے تو ”السلام علیکم یا اہل القبور“ کہنے کی بجائے ”علیم السلام“ لپٹے رہے، لپٹے رہتے“ کہتے تھے۔

آپ کو ایسے بقراء art critics کی صورت میں آرت کی دنیا میں بھی علیم السلام کہتے نہیں گئے۔ انھیں ہمارا بھی سلام پہنچے۔

جلد تقسیم استاد کا خطیبہ باعوم انگریزی میں ہوتا ہے مجھے اس کا بخوبی علم اور احساس ہے کہ ہمارے دفتر و بعد ازاں، درس گاہوں، مجلسوں اور سیمینارز میں غلط نگریزی کی کونجی اردو پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ہمیں تو اردو میں بس ایک ہی بنیادی غرابی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ سمانی سے بھگت سنا جاتی ہے۔ اور سب کی بھگت آ جاتی ہے۔ اسی دلاویز دل کش غرابی کی بنا پر میں نے اس میں اعتبار بنال کا فیصلہ کیا جس پر میں نہ شرمندہ ہوں، نہ معذرت خواہ۔

علامہ اقبال نے جو بات شعر کے بارے میں کہی ہے۔ اس کا اطلاق پوری صداقت کے ساتھ دیگر فنون الفیہ پر بھی ہوتا ہے۔ مولانا گرامی کے ہم پنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”جہاں اچھا شعر و کچھ سمجھو کہ کوئی تذکوی بھی مصلوب ہوا ہے۔“ اسی خیال کو ”مسکو قرطہ“ میں دوسرے ہی اسے میں بیان کیا ہے:

رنگ ہو بخشت و رنگ و چنگ ہو یا حرف صوت

مجزوہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

شاعر اور فنکار جب تک سر و گرم زماں اور کرب آنکھی سے نہ گزرنے وہ کوئی جان وادفن پارہ تحقیق نہیں کر سکتا۔ کیا کہنا ہے کہ ”یہ تنگ درحقیقت نامیا لوگوں کا پیشہ ہے! آرٹسٹ جو کچھ دیکھتا ہے وہ حقیقت نہیں کرتا بلکہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، اسے کیوں پر متعطل کر دیتا ہے۔“ قلم ہو یا موقلم، جب تک ”انگلیاں دیکھ رانی خامہ قوں دیکھ اپنا“ نہ ہو بات نہیں نکلی۔

گو کہ کئے کا شیطان کہتا ہے کہ ”یہ طعمی مشروب پینے کے بعد تمہیں ہر صورت میں خطر آئے گی۔“ میں سمجھتا ہوں کہ چارن کا راس سے بھی بڑا مجزوفن دکھاتا ہے۔ جب اس کا قلم یا بارش کا نقد یا کیوں کو چھوڑتا ہے تو ہر چہرہ و تھیل کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کا اور صرف اسی کا نظر آتا ہے جس کا وہ

واقعا ہے۔ جب ہر چیز سے میں بے چین نظر آنے لگے تو یہ چہنٹ اور برش کا اچھا نہیں، بلکہ ٹھان غالب ہے کہ یہ اس کا بے بسی کا کرشمہ ہے یا زندگی اور شریک زندگی سے فرار کا شاخسانہ۔

واماندگی شوق تراشے ہے پتا ہیں

فن کار ہو یا گلشن نگار اس کے کمال فن کو پرکھنے کی کوئی یہ ہے کہ جو کچھ اس نے خود دیکھا اور محسوس کیا، اسے وہ دوسروں کو اسی شدت احساس کے ساتھ دکھلا سکا ہے یا نہیں۔ رینوا (Renoir) سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی nudes کی جلد کا رنگ روپ بالکل اسطی معلوم ہوتا ہے، اس کا کیا راز ہے؟ وہ ریاض اور مشق و محنت کا شاخسانہ تھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں مستقل پینٹ کیے جاتا ہوں۔ جب کیٹس پر جلد کا رنگ texture اور گداز ایسا ہو جائے کہ بے اختیار رنگ کی لینے کو جی چاہے تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ تصویر ٹھیک بنی ہے۔ دیکھیے اسٹاٹن اور امپیرور میں یہی فرق ہے۔ امپیرور اصل کے جنگی لین کو ترجیح دیتا ہے!

فائل کے طلبہ کے شاہکاروں کے "تھیسس ڈسپلے" میں جہاں Contemporary یعنی عصری اور تازہ بہ تازہ نو بہ موضوعات پر کام دیکھ کر خوشی ہوئی، وہاں چند موضوعات سے عدم دلچسپی اور تاہم حرم والی بے نیازی دیکھ کر اور زیادہ خوش ہوئی۔ علامہ اقبال نے آج سے کم و بیش پچھتر برس پیشتر برصغیر کے فن کاروں اور لکھنے والوں سے گلہ کیا تھا:

بند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

منا ہے اس پر سعادت حسن منٹو نے یہ فقرہ کساکھا کہ مرد کے اعصاب پہ عورت نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے سوار ہوں گے؟ بہر حال، میں نے تو اسٹوڈیوز اور گیلریز میں ہاتھی گھوڑے بھی نہیں دیکھے اٹلن برطرف، جیسا کہ میں نے ذرا اوپر پہلے عرض کیا، یہ امر باعث طمانیت اور انبساط ہے کہ پینٹنگ اور دیگر شعبوں کے علاوہ Sculpture یعنی مجسمہ سازی میں سب سے تیز اور بلند ہانگ سوشل اور سیاسی کمنٹ نظر آتا ہے۔ وہاں جانے اور آسانی سے پہچانے جانے والے حربوں کے دو ہنسنے دیکھے جن کے ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے میں پستول ہے۔ ڈوری کھینچنے سے یہ کھینچ لی نا

مجھے ایک دوسرے کو باری باری پھول پیش کرتے اور یہ قول دکھاتے ہیں۔ اسی طرح دو چہروں والے جنگجوؤں کی صفیں کسی عنوان یا فقرہ کی نوٹ کے بغیر اپنا رزمہ بنا رہی ہیں۔

آر کی فیلچر میں قابل رقبہ انحصار و شغف کا اندازہ نو شہروں جی بلڈنگ کی تجدید و تعمیر عمر مطابق اصل سے ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے حکم کی تعمیل میں ایک قوی ٹیبل جن پلک جھپکنے میں ملکہ سبا کو تخت سمیت اٹھایا تھا۔ لیکن ہمارے جناتی آرکیٹیکٹ تو پورا محل یوں کہ قوتوں اٹھا لائے۔ اگر اس میں کوئی ملکہ عالیہ زندہ یا مردہ حالت میں ہوتی تو مجب نہیں کہ اس عقیقہ کو بھی تخت و تخت پا تخت سمیت لاکے ہمیں کسی درشن جھروکے میں بٹھا دیتے۔ صاحبوا! اینٹ سے اینٹ بٹھانے کا محاورہ تو سنتے آئے تھے جس کے معنی میں بالکل تباہ و برباد کر کے نام و نشان مٹا دینا، آپ نے تو سو سال پرانی اینٹ سے اینٹ جوڑنے کا عالی شان نمونہ ہیر قائمہ کے قلب میں کھڑا کر دیا!

جرمن فلسفی شیلنگ (Joseph Von Schelling) نے آر کی فیلچر کو frozen music یعنی جمجمہ موسیقی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تاریخی عمارت اپنی لغزاتی کہانی اپنی زبانی سناتی ہے۔ ہم اسے جلیقہ رنگ کے وزن پر سنگ رنگ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اس عمارت کی انوکھی تنصیب اور تعمیر کا یہ سے قدیم عمارتوں کے حسن، بقدر و منزلت اور تاریخی اہمیت کا اندازہ اور اعادہ ہوتا ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ تنہا اسی عمارت پر منحصر نہیں۔ گراہی میں Renaissance اسٹاک کی خوبصورت عمارتیں اور Gothic طرز کی نازک عمارتیں کب سے ہماری داد و تحسین کی طالب و منتظر کھڑی ہیں۔ وہ اپنے سن اور دل کش خطوط کی داد وصول کرنے کے لئے اسٹیج پر ملک ملک کے Cat Walk نہیں کر سکتیں۔ خود ہمیں ان کے سامنے نگاہ دوہرا کر مایوس یا غافل نظر کرنا چاہیے۔ جو ادارے اور درس گاہیں اس شہر اور اس کے ماضی اور آثار قدیمہ کی قدر کرنا سیکھتے ہیں۔ وہ ایک ثقافتی فرض کفایہ انجام دیتے ہیں۔ ایک ایسا فرض جس کی ادائیگی وہ انضام و انبساط بخشی ہے جو کسی طور پیش فراوان سے کم نہیں۔ آخر عیش کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف غالب نے تخت کے نام اپنے ایک خط میں کی ہے جسے اس بارہ خاص میں حروف آفرجھٹا چاہئے۔ دو لگتے ہیں۔

سلا صاحب، جس شخص کو جس شکل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف غمر سر کر کے اس کا نام پیش ہے۔

کراچی کی عمارتیں نہ اتنی قدیم ہیں جتنی کہ یونان اور روم کی ذاتی پر امن جتنے کاشاک کے استوپا، لیکن خوبصورت ہونے کے لئے پیرے پر پھریاں ہوتی ضروری ٹیکرا۔ امریکہ میں تو ستر سالہ عمارت قدیم تصور کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ بزرگوں کا ماسلوک کرتے ہیں یعنی عمارت آمیز۔ امریکہ کے پاس بہترین جغرافیہ اور مختصر ترین تاریخ ہے جو اتنی تازہ ہے کہ اس پر حالات حاضرہ کا گمان ہوتا ہے۔

کراچی کی عمارتوں کے آرکیٹیکچر سے واقفیت اس لئے ضروری ہے کہ ملازمین آدمی ٹیکر ابھی اپنا سراپا اور قابل قبول لب و لہجہ دریافت نہیں کر پایا ہے۔ اسے آدھا ٹیکر بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے ہمیں آدھے بچہ آدھے پیر پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ دونوں عمارتی طبعیت پر ہوں۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آیا۔ مرحوم رزقی جن کی تصویر آپ کے ہال میں آویزاں ہے۔ بڑے ہانگے اور طرح دار آرکیٹیکٹ تھے۔ ایک دفعہ میرے بہت ہی عزیز دوست میاں فضل حسن ان سے میرے مکان کا نقشہ بنوانے گئے۔ مجھے شخص ڈسٹر انچ کی خاطر لے گئے۔ وہ کلاسیکی عمارت کے آدمی تھے۔ رزقی صاحب نے ایک دف اسکیج بنا کر دکھایا تو فضل صاحب کہنے لگے کہ اس میں تھوڑا سا مغل آرکیٹیکچر کا بچہ دیکھئے۔ دو تین خوبصورت عمارتیں، ایک آدھا آرائشی طاق اور کہیں سنگ مرمر کی خوبصورت سی جالی۔

رزقی صاحب نے اپنا اسکیج فوراً اچھا دیا اور لے لے "آپ پر عقلی صاحب کا مکان بنوانے آئے ہیں یا مقبرہ؟"

قدیم عمارتیں ہر اعتبار سے قوی انشا اور روش ہیں۔ وہ اس شہر اور قریبے کا زیور ہیں جہاں وہ ہیں۔ وہ ایسی ہی خوب اور دلچسپ رکھ کر مطالبہ کرتی ہیں جو نازک زیورات سے شخص ہے۔ ہر عمارت اپنے عہد کا آئینہ ہوتی ہے۔ اپنے اداکاروں سے کلام کرتی، اس میں دل کو کھینچتی اور غور و تدبر پر آمادہ کرتی ہے۔ مگر جو آدمی نرخی کھنڈرات سے لگ کر اپنی گھسانائی اور ترس بھاؤ دکھاتی ہے۔ معروف

نقل اس عہد کے فن نگاری کی تو متعلقہ است بن جاتا ہے۔

آرکیٹیکٹ سنگ و فست سے اپنے خواب کی تعبیر تعمیر کرتا ہے۔ وہ کیا دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ سنگ سادہ کو انکاڑ کا رنگ کیسے دیتا ہے۔ اس کی تصویر ہنگیرین آرٹسٹ Breuer نے بڑے دلکش انداز سے کھینچی ہے۔

Colour which you can see with ears; sounds to see with eyes; the void you touch with your elbow; the taste of space on your tongue; the fragrance of dimensions; the juice of stone.

اب اسے ایک فقیر ہے۔ پوریش کی ہے غری کیسے یا ایک پشیدہ و سرخوردہ کی مصیبت اندیشی کہ میں نے قوی، معاشی مسائل اور حالات حاضرہ پر اظہار خیال کرنے سے عدا کر پڑ گیا۔ اس موضوع پر میں نے ایک جامع اور جامع سرزنش جملہ ٹیکر رکھا ہے جس میں دانائی سے زیادہ ملازمانہ روش احتیاط چھپتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "دنیا جہان میں جہاں بھی ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ وہ ہمارا ہی اجازت دیا ہے کہ بغیر ہولاء اور ہائے۔" اس کا اطلاق بڑے سمجھوتہ حال پر ہوتا ہے جو کبھی موجودہ کہلاتی تھی۔

نظر آتی ہی نہیں صورت حالات کوئی

اب ہی صورت حالات نظر آتی ہے

دیکھیے، میں نے پھر خود اظہار خیال کرنے کی بجائے شیخ حنیف جالندھری کے سامنے رکھ دی۔ یہ بھی اظہار خیال کی ایک مثال صورت، نہ آپ کو یا، ہوگا کہ آرٹسٹ گمان ہے۔ کبھی تو عہدہ کو اپنی شہرت کے لئے کہے جاسے رہے۔ اسے اپنا گمان کا نہ کرنا چاہتا تھا۔

سما شہرے اور مہینے کے معاشی اور غیر معاشی مسائل کی موجودگی اور تعلیم نے ہمیں بھی انکار نہیں کر سکتا۔ میں کوئی وزیر توڑا ہوا ہوں لیکن یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ برصغیر کا راجہ جہازرہا "Pessimistic" یعنی قوی اور پشیدہ رہا ہے اور لہجہ حسیں دیکھو گئے۔ گئے تلخ و ترش، کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک دوسرے سے خارج سناہتا ہے کہنے میں نہیں جڑا آتا ہے۔ ہمیں اس کا احساس تک نہیں کہتی، کبھی اور عیب خور و بہار سے مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ ہم روشن مستقبل کو گمراہ کیا، رنگ کے بن گلاسز سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ملک کے مستقبل اور سلامتی کے بارے میں

ماپیں کن اور یاس انگیر پاتیں کرنا ہمارے دانشوروں، سیاست دانوں، تبصرہ و نگاروں اور ڈانگلک دوم کے بقراطوں کا پسندیدہ و مشغلہ بننا جاریا ہے۔ اس پر یا آ یا کہ ادیب شہیر شاہد احمد بلوی مرحوم کے دفتر میں ایک مٹھی کام کرتا تھا۔ وہ ہر وقت ہر کس و نا کس سے بیوی کی برائی کرتا رہتا تھا۔ سنے والے عاجز تھے۔ ایک دن وہ شاہد احمد صاحب سے بیوی کی نہائی کرنے لگا تو انہوں نے پوچھا ”مٹھی جی، کیا آپ کی بیوی سوتیلی ہے؟“

تو کیا ہم سوتیلی ملک کی روٹی اور ملک کھاتے ہیں! کبھی کبھی تو ہم اپنے وطن عزیز سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے خاکم بدین، یہ دشمن ملک یا دارالحرب ہوا!

خواتین و حضرات! میں یہ بات صاف کہنے کے لئے تیار ہوں کہ گزشتہ پچیس برس کے دوران ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ ادیب کسی نہ کسی لیڈر یا منت کے ٹھکانے سے یہ مڑو جا نکاو نہ بنایا ہو کہ ملک اس وقت بہت نازک دور سے گزر رہا ہے اور انت یہ جب وقت آن پڑا ہے۔ صاف ہو یہ کہی نکلتا ہے جو پچیس برس سے مسلسل ملی آ رہی ہے۔ یہ تو بڑی مضبوط اور مستحکم قسم کی نراکت معلوم ہوتی ہے۔ وہ پے در پے کراس اور داغی بخراں جس سے ہم نصف صدی سے ڈرا رہے جا رہے ہیں، بھرانہ ملک تو ہم کا تیرہ نہ لگا کر سیکو اور نہ بھی لگا کر سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ نظریاتی ملک، جس کا خواب ہمارے پرکھوں نے دیکھا، سدا قائم اور پائیدار رہنے کے لئے بنا ہے۔ فن کار کے لئے ماپیں ہی نہیں، بے محی بھی حرام ہے۔ وہ جو دواں، پیچیم دواں، ہر دم جواں زندگی کا دکاس، فطاش اور صورت گر ہے۔ مولانا دروم فرماتے ہیں کہ میں روشنی کے سرچشمے کا رستار ہوں۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی دیکھتا ہوں۔ میں شب اور طلعت شب کی پہچان نہیں کرتا۔ خواب کا احوال بیان کرتا ہوں:

پہ غلام آقا ہم، ہم آقا بے غم
نہ شیم، نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

☆ ☆ ☆

پس نوشت

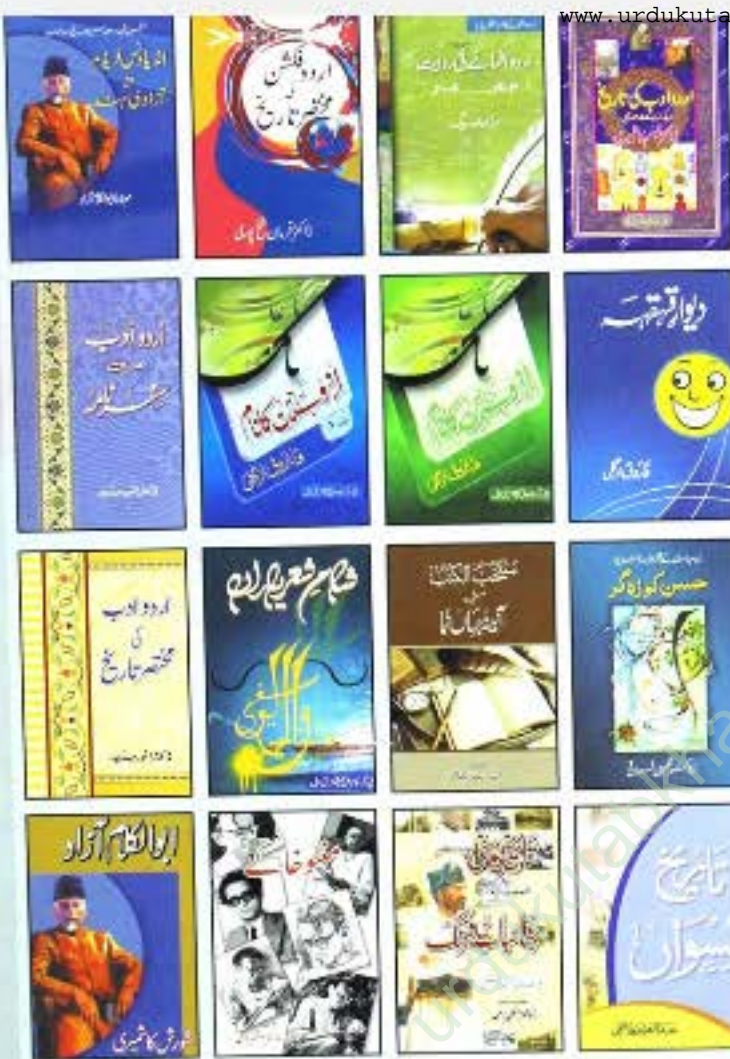
یہ کتاب ابھی طباعت کے مراحل سے گزری رہی تھی کہ کراچی سے مڑوہ جانغز آ یا کہ مشتاق احمد یوسفی کی پانچویں کتاب ”شام شعر یاراں“ زیور طبع سے آراستہ ہو گئی ہے۔ یہ اتفاق ہماری کتاب میں شامل مضمینوں مضامین اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ اسے قلمبر بھر جائیں اور لطف اندوز ہوں۔

مظہر احمد



اردو کتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT



پس نوشت

یہ کتاب ابھی طباعت کے مراحل سے گزر رہی رہی تھی کہ کراچی سے مژدہ جانفزا آیا کہ مشاق احمد یوسفی کی پانچویں کتاب ”شام شہریاراں“ زیور طبع سے آراستہ ہو گئی ہے۔ یہ اتفاق ہماری کتاب میں شامل تینوں مضامین اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ اسے قلم کر رہے تھے اور لطف اندوز ہوں۔

مظہر احمد

M.R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abhis26@hotmail.com

